مرزا اسد اللہ خاں

غالب

رضیہ سجاد ظہیر

غالب

(بچّوں کے لئے)

اچھی
کتاب
کا
نکھار
ہمیشہ
قائم
رہتا
ہے

غالب

(مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ)

رضیہ سجّاد ظہیر

ناشران

آئینۂ ادب۔ چوک مینارہ انارکلی لاہور

پاکستان میں پہلی مرتبہ
۱۹۶۴
تعداد گیارہ سو
قیمت: دو روپے

اہتمام
م، ع، سلام، آئینۂ ادب۔ چوک مینار
انارکلی ۔ لاہور

(نقوش پریس لاہور میں طبع ہوا)

پیارے بچّوں

کے

نام

پہلا باب

اسکول جاتے آتے یا اپنے ہی محلّے یا سڑک پر تم نے وہ تماشا تو دیکھا ہو گا جس کے موکھے میں مُنھ ڈال کر تم کلکتے، بمبئی اور کراچی کی بندرگاہ، آٹھ من کی دھوبن اور راجہ کی مالن دیکھتے ہو۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ اِس موکھے میں جو شیشہ لگا رہتا ہے یہ سب اِس کا جادُو ہے۔ لیکن انسان کے پاس ایک اور بھی شیشہ ہے جس میں جھانک کر وہ دیکھے تو اسے صرف آج کل کی نہیں سینکڑوں برس پہلے کی باتیں بھی نظر آنے لگتی ہیں۔

یہ شیشہ ہے تاریخ!

آؤ اب ہم تم اِس موکھے میں جھانک کر دیکھیں جس میں یہ شیشہ لگا ہے! آگرہ کی طرف دھیان رکھنا۔ دیکھو وہ دُور سے تاج محل کے مینارے نظر آ رہے ہیں نا، قلعہ کا بھی تو کچھ کچھ حصّہ دکھائی دے رہا ہے!

ہاں ٹھیک ہے!

اچھا اب جمنا سے لگی لگی جو ریتلی سڑک ہے اِس پر چلتے ہوئے ہم شہر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کٹرہ کشمیرن والا اور کٹرہ گدڑیوں والا سے ہوتے ہوئے ہم سلیم شاہ کے تکیے کے پاس پہنچ گئے ہیں!

اوہو، کیا بہار ہے! شروع گرمیوں کا زمانہ ہے، لوگوں نے کوٹھے پر جمائو کیا ہے، صاف سُتھرے، اُجلے بستر، پانی چھڑکی ہوئی گچیں، سوندھی سوندھی، کچّی مٹّی کی صراحیوں پر کاغذی آبخورے، بھینی بھینی خوشبو والے پھُول، طشتوں میں خربوزے اور تربُوز کٹے ہوئے پڑے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ اور آسمان پر نظر ڈالو تو جیسے رنگین پھُولوں کا قالین بچھا ہو۔ پتنگوں کا زمانہ

ہے نا!

گھنٹہ گھر والی حویلی اور وہ جو اُسی کے پاس سُرخ پتھر کی دوہری حویلی دکھائی دے رہی ہے، اِن دونوں کے بیچ میں ایک بڑی حویلی اور بھی تو ہے۔ کیسی شاندار اور خوب صورت بنی ہوئی۔ اِس کی چھت پر —— ہاں ہاں تم نے ٹھیک دیکھا —— ایک لڑکا پتنگ اُڑا رہا ہے۔ ہوگا کوئی سات آٹھ سال کا۔ خوب گورا رنگ، چوڑی چوڑی ہڈّیاں، تیکھا نقشہ، شربتی آنکھیں، اُلجھے اُلجھے بال —— پیچھے کی طرف راجہ بلوان سنگھ کی حویلی ہے۔ ان کی عُمر بھی اس وقت اتنی ہی ہوگی۔ دونوں میں پیچ ہو رہے ہیں!

یہ لڑکا صورت سے تُرک لگتا ہے، ضرور اس کے آبا واجداد تُرک رہے ہوں گے۔ آؤ چل کر پُوچھیں!

لو اسے تو کوئی پکارنے لگا! نیچے سے کسی عورت کی آواز آ رہی ہے "نوشہ۔ اے میاں نوشہ"۔ شاید اس کی ماں پکار رہی ہیں۔ لڑکا پھرتی سے پتنگ کی ڈور لپیٹنی شروع کرتا ہے اور

دھیرے دھیرے گنگناتا جاتا ہے۔

تم جانتے ہو نا کہ "نوشہ" کے کیا معنی ہیں؟ فارسی میں دُولھا کو نوشاہ کہتے ہیں۔ اِس بچّے کا نام نوشہ اِس لئے ہے کہ اِس کے باپ کا پورا نام مرزا عبداللہ بیگ عُرف دُولھا میاں ہے اور اِس کا نام مرزا اسداللہ بیگ عُرف نوشہ میاں ہے!

اسداللہ خاں؟ یہ نام تو کچھ سُنا ہوا سا، پڑھا ہوا سا لگتا ہے؟ —— ہم بتائیں —— تُم نے اِس نام کے ساتھ ایک اور نام پڑھا ہوگا۔ اِس سے کہیں زیادہ مشہور — وہ نام ہے غالب، اور وہ بھی اِسی بچّے کا نام ہے۔ ابھی نہیں — آگے چل کر۔ کیونکہ یہی وہ لڑکا ہے جو بڑا ہوگا تو مرزا غالب بنے گا! اُردو کا عظیم شاعر جس کے نام کی آج ہم عزّت کرتے ہیں، جس کی فلم "مرزا غالب" تم نے دیکھی ہوگی، جس کے نام کے ٹکٹ تم نے لفافے پر لگا کر لفافہ ڈاک میں ڈالا ہوگا! لوگ کہتے ہیں اور ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ مُسلمانوں نے ہندوستان کو دو ایسی چیزیں دی ہیں جن کی خوب صورتی امر ہے! ——

ایک تاج محل اور ایک دیوانِ غالب۔

آگرہ بھی کیسا خوش نصیب شہر ہے کہ جہاں تاج محل جیسی عمارت بنی اور مرزا غالب جیسا شاعر پیدا ہُوا۔

دُوسرا باب

مرزا غالب کے خاندان والے سلجوقی تُرک تھے۔ ان کے باپ ہندوستان میں ہی پیدا ہوئے تھے کیونکہ ان کے دادا قوقان بیگ، اپنے باپ سے کسی بات پر ناراض ہو کر، محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں، سمرقند سے ہندوستان چلے آئے تھے۔ یہ لوگ تُرکی زبان بولتے تھے اور فوج کا کام ان کا پیشہ تھا۔ یعنی فوج میں نوکریاں کرتے تھے۔ مرزا غالب نے خود لکھا ہے۔

سو سال سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

فوجیوں کے خاندان میں ایسی نفیس اور فنکارانہ طبعیت رکھنے والے

شاعر کا پیدا ہونا تعجب کی بات تو ضرور ہے لیکن اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاعر بنتے نہیں، پیدا ہوتے ہیں! اور شاید یہی سبب ہے کہ مرزا نے اپنے لئے شاعری میں ایک الگ ہی راستہ نکالا۔ اگر خاندان میں اور شاعر ہوتے تو ممکن ہے مرزا اُن کی پیروی کرتے لیکن وہاں دُور دُور کوئی شاعر نہ تھا — مرزا نقل کرتے تو کس کی اور رنگ اپناتے تو کس کا؟

اِن کے باپ اَلوَر کے راجہ بختاور سنگھ کے یہاں فوج میں نوکر تھے۔ ۱۸۰۲ء میں راجہ الور کی ریاست میں زمیں دار نے بغاوت کی، مرزا کے باپ اِس بغاوت کو کچلنے کے لئے فوج دے کر بھیجے گئے اور اُسی لڑائی میں مارے گئے۔

مرزا کی عمر اس وقت کوئی سات سال کی ہوگی! ان کی ماں ایک سمجھ دار اور پڑھی لکھی بی بی تھیں، انھوں نے مرزا کی تعلیم کا اچھا انتظام کیا۔

سب سے پہلے بسم اللہ ہوئی۔

بسم اللہ تو تمھاری بھی ہوئی ہوگی، لیکن اگر تمھیں یاد نہ ہو تو

اپنے کسی چھوٹے بھائی یا بہن کی بسم اللہ تو دیکھو گے ہی۔ اُس دن بچّہ پہلی بار پڑھنا لکھنا شروع کرتا ہے۔ اِس کو اچھے اچھے نئے کپڑے بنوا کر پہنائے جاتے ہیں، گھر کے سب رشتہ دار اور دوست جمع ہوتے ہیں اور سب اِس بچّے کو روپئے دیتے ہیں، مزے دار مٹھائیاں منگوائی جاتی ہیں، پکوان تلے جاتے ہیں اور ایک چاندی کی تختی اور چاندی کا ہی قلم بنوایا جاتا ہے، ایک پیالی میں زعفران گھولی جاتی ہے پھر اچھی گھڑی دیکھ کر مولوی صاحب بچّے کے ہاتھ میں قلم دیتے ہیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر قلم زعفران میں ڈبو کر تختی پر اس سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھواتے ہیں۔ بچّے کے منھ میں سب سے پہلے مٹھائی دینے کے بعد پھر سب لوگ مٹھائی کھاتے ہیں، اور بانٹتے ہیں، گانا بجانا ہوتا ہے۔

تو مرزا غالب نے بھی اس دن اچھّے اچھّے کپڑے پہنے ہوں گے اور اُستاد نے ان کا بھی ہاتھ پکڑ کر تختی پر لکھوایا ہوگا۔ لیکن وہاں جتنے لوگ تھے کیا اِن میں سے کوئی بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ تختی پر ٹیڑھا ٹیڑھا "بسم اللہ" لکھنے والا یہ ننّھا مُنّا سا ہاتھ ایک دِن ایسے

ایسے شعر لکھے گا کہ ساری دُنیا کی ساری زبانوں میں اِن شعروں کے ترجمے ہوں گے اور لوگ اس کی شاعرانہ بڑائی اور عظمت کے آگے اپنا سر جھکائیں گے!

محلّے ہی میں ایک مولوی صاحب تھے جن کا نام محمد اعظم تھا، اُن کا مکتب بہت مشہور تھا کیونکہ یہ عربی، فارسی، اُردو اور دوسرے بہت سے علوم کے ماہر تھے اور بڑے قابل تھے، لیکن —— اب اِس زمانے کے مکتبوں کا حال تم اپنے ابّا سے پُوچھنا، ہم کیا بتائیں، لگ بھگ سب جگہ ایک ہی سا حال تھا یعنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ پٹائی کی بھی بھرمار!

ویسے مرزا کے جو اُستاد تھے وہ تھے تو نیک آدمی لیکن اپنے شاگردوں پر بڑی کڑی نظر رکھتے تھے۔ ننھے نوشہ کو پڑھنے لکھنے کا تو بہت شوق تھا لیکن مکتب کی پڑھائی سے اس کا بہت جی گھبراتا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اِسے الفاظ آگے پیچھے کرکے شعر بنانے کی بھی مہلت ملے —— اور وہ ملتی نہیں تھی۔

نُو سال کی عُمر میں غالب نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا! مولوی صاحب اپنے شاگرد کی تیزی اور ذہانت سے تو خوش تھے لیکن اِس تیزی کا بہاؤ جس طرف تھا یعنی شاعری کی طرف وہ اِن کو پسند نہ تھا۔ چُنانچہ مسلسل ایک تَنا تنی سی اُستاد شاگرد میں رہتی تھی!

ایک بار مرزا نے ایک غزل کہی اور بڑے شوق سے اپنے اُستاد کو دکھائی، سوچے ہوں گے کہ اُستاد بڑے خوش ہوں گے، خوب شاباشی ملے گی، وہاں اُلٹی پھٹکار ہاتھ آئی۔ اُستاد نے ڈنڈا سنبھالا اور بولے "یہ کیا مہمل بکتے ہو، بے معنی باتیں! جیسی ردیف تم نے اِستعمال کی ہے ایسی کِسی شاعر نے نہیں استعمال کی۔ جاؤ اپنا کام کرو دِل لگا کر۔ ٹانگ برابر کا لڑکا! شعر کہنے چلا ہے"۔

ننھے نوشہ کے دِل کو کِس قدر چوٹ پُہنچی ہو گی!

لیکن تم جانتے ہو کہ جو لوگ آگے چل کر بڑے بننے والے ہوتے ہیں وہ شروع کی نا اُمیدیوں سے مایوس ہو کر کبھی

نہیں بیٹھ رہتے! مرزا دو چار آنسو بہا کر پھر شعر کہنے میں جُٹ گئے!
اور یہی نہیں انھوں نے اُردو اور فارسی کے بڑے بڑے شاعروں کے دیوانوں کو کھنگھولنا شروع کیا۔ کیونکہ اِن کو یقین تھا کہ جیسی ردیف انھوں نے استعمال کی ہے اِس کی سند ضرور کسی بڑے شاعر کے یہاں ملے گی۔

ڈھونڈتے ڈھونڈتے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے، فارسی کے ایک بہت بڑے شاعر ظہوری کے یہاں وہ ردیف مِل گئی!۔ دَوڑے ہوئے ظہوری کا دیوان لئے، اُستاد کے پاس پہنچے، اُستاد نے ظہوری کی غزل دیکھی، پھر ان کی اور پھر ان کو گلے سے لگا لیا! ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات! —— آج ان کے اُستاد کو پہلی بار یہ خیال آیا کہ جس بچے کو وہ پڑھا رہے ہیں وہ تو ممکن ہے کہ آگے چل کر کوئی بہت بڑا شاعر بنے! اتنا سا بچہ اور اتنی لگن، اِتنی محنت اور اِتنی تلاش!

ہم نے بھی تمھیں یہ بات اِس لئے بتائی ہے کہ مرزا جو مکتب کی پڑھائی سے گھبراتے تھے تو اِس سے تم یہ نہ سمجھنا کہ وہ

پڑھنے یا محنت کرنے سے گھبراتے تھے۔ نہیں۔ البتّہ وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ جو کچھ وہ پڑھیں، اپنے شوق اور پسند سے پڑھیں اور اپنی پسند کی پڑھائی میں وہ بہت محنت کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے علم میں کوئی کمی نہیں رہی اور ان کے زمانے میں اِن سے بڑا فارسی زبان کا عالم اور جاننے والا دُوسرا کوئی نہ تھا۔

انھوں نے آخر عُمر میں کِسی سے باتیں کرتے ہوئے کہا تھا۔ "میں نے باقاعدہ مکتب جانا اور پڑھنا لِکھنا دس گیارہ بارہ سال کی عُمر سے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا، ماں بھی ناراض ہوئیں، ماموں بھی خفا ہوئے پر مَیں نے دوبارہ مکتب کی طرف مُنھ نہیں کیا۔ اب سوچتا ہوں کہ ایسا کچھ خاص نقصان بھی نہیں ہُوا۔ بھلا اِس قسم کی پڑھائی جاری رہتی تو زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوتا کہ لوگ مجھ کو مولوی کہنے لگتے۔"

تم بھی مرزا کے بالکل شروع کے دو چار شعر سُنو اور ان سے مزہ لو۔

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے اسدؔ
ہر رات شمع، شام سے لے تا سحر جلے

اور ——

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

تیسرا باب

مرزا کے لڑکپن کے زمانے میں، آگرہ میں، ایک اور بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ ان کا نام نظیرؔ تھا۔ یہ صُوفی تھے، جگہ جگہ گھُومتے تھے، ہر طرح کے لوگوں سے ملتے تھے، جنتا کے دل کی بات جنتا ہی کی زبان میں کہتے تھے ان کی شاعری بہت سچّی، رسیلی اور مزے دار تھی۔ ان کی مشہور نظم۔

"سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لا دچلے گا بنجارہ"

تُم نے پڑھی یا سُنی ہو گی۔

جب آگرے کے بچّے بچّے کی زبان پر نظیرؔ کے شعر تھے تو ضرور مرزا غالب نے بھی نظیرؔ کے شعر پڑھے اور سُنے ہوں گے، اور

اس سے ان کو ضرور اُکساؤ ہوا ہوگا۔ لیکن کچھ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ مرزا غالب نظیر کے شاگرد تھے یہ بات صحیح نہیں ہے!

تمھیں معلوم ہے ناکہ شاعری میں اُستادی شاگردی کے کیا معنی ہیں!

بات یہ ہے کہ اس زمانے میں ہر نیا اور نوجوان شاعر جب شعر کہنا شروع کرتا تھا اور تھوڑا بہت کہنے لگتا تھا تو پُرانے اور بڑے اُستادوں میں سے کسی کو اپنا خاص اُستاد مان لیتا تھا۔ پھر جو کچھ شعر بھی وہ کہتا اپنے ان اُستاد کو دکھاتا اور ان کے مشورے اور صلاح سے اپنی شاعری میں کانٹ چھانٹ کرتا، اور اسے درست کرتا۔ ایک ایک اُستاد کے بیسیوں ہی شاگرد ہُوا کرتے تھے اور ان اُستادوں کے یہاں شاگردوں کا دربار سا لگا رہتا تھا جس میں اُستاد بادشاہ سے کم نہ ہوتا تھا۔

مزہ کی بات یہ ہے کہ یہ اُستاد شاعر تو سب آپس میں ایک دُوسرے کے دوست ہوا کرتے تھے لیکن ان کے شاگردوں میں اکثر خُوب پُرلُطف لڑائیاں ہُوا کرتی تھیں اور نوک

جھونک چلا کرتی تھی جو زیادہ تر اِس بات پر ہوتی تھی کہ کون اُستاد بڑا ہے اور کون چھوٹا ۔۔۔ "مدّعی سُست گواہ چُست" والا معاملہ ہوتا تھا!

مرزا غالبؔ کے متعلّق ایک حیرت کی بات یہ ہے کہ اس طرح کی شاگردی انھوں نے کسی شاعر کی نہیں کی!

ایک اور دلچسپ بات تمھیں سُنائیں!

اُسی زمانے میں ایک اور بہت بڑے شاعر تھے اُن کا نام میرؔ تھا۔ تُم نے بھی سُنا ہوگا۔ یہ غزل کے اتنے بڑے اُستاد تھے کہ ہم اُردو والے اُن کو "خدائے سُخن" کہتے ہیں۔ یہ بھی آگرے کے تھے، پھر دہلی میں بہت سال رہے اور آخر میں پریشانیوں سے تنگ آکر لکھنؤ چلے گئے تھے۔

تُم کو تو معلوم ہوگا کہ میرؔ صاحب ذرا نک چڑھے تھے ۔۔۔ بھئی آخر اتنے بڑے شاعر جو تھے ۔۔۔ جلدی کسی کی تعریف نہیں کرتے تھے اور تیوری پر بل ڈالے بغیر کسی کا کلام نہیں دیکھتے تھے۔

ایک بار ایک نواب صاحب دہلی سے لکھنؤ گئے تو غالب کی ایک غزل اپنے ساتھ لے گئے۔ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ لوگ ایک شہر کے شاعروں کا کلام دوسرے شہر لے جایا کرتے تھے۔ سوغات کی طرح۔

غالب کی عمر اس وقت تیرہ ۱۳ سال سے بھی کم تھی۔

ہاں تو اُن نواب صاحب نے وہ غزل میر صاحب کو دکھائی۔ جانتے ہو میر صاحب نے کیا کہا؟ بولے "اگر اِس لڑکے کو کوئی اچھا اُستاد مل گیا اور اُس نے اِس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بنے گا —— ورنہ مہمل بکے گا۔"

ذرا سوچو تو کہ تیرہ ۱۳ سال سے کم عُمر کا لڑکا ایسے شعر کہتا تھا کہ لوگ ایک شہر سے دُوسرے شہر لے جایا کرتے تھے۔

میر صاحب نے غالب کے بارے میں جو پیشین گوئی کی تھی وہ بالکل ٹھیک نکلی۔ غالب واقعی لاجواب شاعر ہوئے لیکن یہ بھی ایک ان کی تعریف ہے کہ بغیر اُستاد کے لاجواب ہو گئے ——

ہم نے تمھیں بتایا ہے کہ غالب نے شاعری میں شاگردی کسی کی

نہیں کی ـــــ لیکن ان کے پڑھنے لکھنے میں، فارسی زبان کو اچھّی طرح جاننے میں، اور شعر کہنے کی طرف دِل بڑھانے میں ایک شخص کا ہاتھ کافی تھا!

اِس شخص کا نام پہلے ہُرمز تھا اور پھر عبدالصمد، کیونکہ یہ پہلے آتش پرست پارسی تھے اور بعد کو مُسلمان ہوگئے تھے۔ ایران کے رہنے والے تھے اور عرب کے مُلکوں میں رہ کر عربی زبان بھی اچھّی طرح سیکھی تھی۔ سیر سپاٹا کرتے ہوئے ہندوستان بھی آئے تھے۔ جب آگرے پہنچے تو یہاں غالؔب نے اُن کو پکڑ لیا اور دو سال تک اپنے یہاں مہمان رکھا۔ اِس مہمانی کے دَور میں غالؔب نے عِلم کے اِس سمندر سے خُوب موتی چُنے!

ان کو بھی غالؔب سے اِتنی محبّت ہوگئی تھی کہ ہندوستان سے جانے کے بعد، کِسی اور مُلک سے انھوں نے غالؔب کو خط میں لِکھا ـــــ "میری طبیعت بڑی آزاد ہے۔ یہاں کِسی کا گذر نہیں۔ لیکن میرے عزیز، تم نہ جانے کیسے ہو کہ تمھاری یاد بار بار آکر اِس آزادی میں رُکاوٹ ڈالتی ہے۔"

مرزا نے بھی جہاں کہیں ان کا ذکر کیا ہے، بڑی محبّت اور عزّت کے ساتھ کیا ہے۔ انھیں اپنے ان اُستاد سے بہت محبّت تھی!

اب ہم تمھیں ایک بات اور بتادیں ۔ اور پھر ہم اور تُم مرزا غالبؔ کے ساتھ آگرے سے دہلی چلیں گے!

وہ بات یہ ہے ــــ شاید تمھیں ہنسی آئے گی سُن کر ــ کہ تیرہ ۱۳ سال کی عُمر میں غالبؔ کی شادی ہوگئی۔

انھوں نے اپنے آخر زمانے میں اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے لکھا ہے "۱۸۰۹ء میں میرے لئے حبس دوام (یعنی عُمر قید) کا حُکم ہُوا۔ ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پاؤں میں ڈال دی اور دہلی شہر کو زندان مقرّر کیا اور مجھے اِس زندان میں ڈال دیا"۔

مرزا غالبؔ کی بیوی کا نام امراؤ بیگم تھا۔ چھوٹے سے قد کی خوبصورت بیوی تھیں اور اپنے میاں سے بہت محبّت کرتی تھیں، غالبؔ میں اور ان میں اکثر جھگڑے ہُوا کرتے تھے۔ یہ جھگڑے بڑے دِل چسپ ہوتے تھے اور دونوں کے بہت مزے دار

لطیفے مشہور رہیں۔

مثلاً ایک بار مکان بدلنا تھا۔ پہلے غالب خود جا کر دیکھ آئے لیکن صرف باہر کا حصّہ دیکھ سکے۔ کیونکہ پردے کی وجہ سے اندر نہیں جا سکے تھے۔ چنانچہ امراؤ بیگم اندر کا مکان دیکھنے گئیں۔ جب واپس آئیں تو مرزا نے پوچھا "کہئے کیسا مکان ہے۔ پسند آیا؟"

وہ بولیں ـــ "مکان تو اچھا ہے۔ پر اس میں تو کوئی بَلا بتاتے ہیں۔"

غالب نے ہنس کر کہا "اچھا! بھلا آپ سے بڑھ کر بھی کوئی بَلا ہے۔"

غالب کے ایک رشتے کے پوتے خضر مرزا نے لکھا ہے۔

"میں ایک دن مرزا صاحب کے یہاں گیا۔ اوپر سیڑھیوں سے اُتر رہے تھے، میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "آ ـــ تیری دادی کے گھر چل رہا ہوں (یعنی اندر زنانے میں) اندر پہنچے تو ماما سے دادی کے بارے میں پوچھا پتہ چلا کہ نماز پڑھ

رہی ہیں۔ کہنے لگے "یہ کیا ہے بھئی، جب آؤ نماز، جب آؤ نماز۔ ارے خضر، تیری دادی نے تو گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا دیا۔"

بات اصل یہ تھی کہ غالب تھے فن کار اور شاعر، آزاد طبیعت فقیر مزاج، گھر داری اُلجھنوں اور ذمہ داریوں سے گھبرانے والے۔ اور امراؤ بیگم سیدھی سادی، گرہست بی بی تھیں اس لئے ان کو شوہر کی کچھ باتیں کھل جایا کرتی تھیں۔

ویسے دونوں میاں بیوی میں بہت محبت تھی اور دونوں ایک دوسرے کا لحاظ اور خیال کرتے تھے۔ اور اس چاہت کا ایک بڑا عجیب سا ثبوت یہ ہے کہ غالب کے مرنے کے ٹھیک ایک سال بعد — اسی دن جس دن غالب مرے تھے — ایک طرف ان کی برسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف امراؤ بیگم اس دنیا کی اُلجھنوں کو چھوڑ کر اپنے شوہر کے پاس سدھاریں۔

آؤ — اب مرزا کا گھر بار آگرے سے دہلی روانہ ہو رہا ہے۔ سامان بیل گاڑیوں میں لادا جا رہا ہے، سواریاں رتھوں اور پالکیوں میں بیٹھ رہی ہیں، کچھ مرد اور نوکر چاکر گھوڑوں

پر بھی ہیں ایک رتھ میں پندرہ[۱۵] سولہ[۱۶] برس کے مرزا غالب اور بارہ[۱۲] تیرہ[۱۳] برس کی ان کی دُلہن امراؤ بیگم، ہچکولے کھاتے مزے مزے کی باتیں کرتے ایک دُوسرے کو چھیڑتے، ہنسی مذاق کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ہم لوگ بھی اِسی رتھ کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟

چوتھا باب ۴

یہ ۱۸۱۲ء کا دہلی شہر ہے۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ذرا سیر دیکھو کیا ہنگامہ ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کہیں بھان متی کا تماشہ ہو رہا ہے، کہیں بازی گروں کے کرتب، کہیں خوانچہ والوں کی صدائیں، سودے والوں کی آوازیں، اور ان سب پر چھائی ہوئی چٹ پٹے کبابوں، خوشبودار پھولوں اور مزے دار مٹھائیوں کی مہک!

لیکن ہم لوگوں کو تو چاندنی چوک کی طرف مڑنا ہے۔ بلّی ماراں میں ذرا دور اندر جا کر شمسی دوا خانہ نظر آنے لگے گا۔ کچھ پرانی

پرانی عمارتیں، چھوٹی بڑی حویلیاں - اور پھر گلی قاسم جان -
جب یہ گلی بائیں ہاتھ کو گھومے گی ——— بھئی ذرا ہوشیاری سے
چلنا، یاد رکھنا کدھر سے آئے تھے - یہ دلّی کی گلیاں ہیں، کوئی
ہنسی کھیل نہیں ہے -

لو ——— وہ سامنے ایک محراب نظر آنے لگی - یہ مرزا غالب
کے سُسرال کی حویلی ہے ——— جب وہ پہلی بار دہلی آئے تھے تو
اسی حویلی میں رہے تھے!

لیکن یہ نہ سمجھنا کہ وہ ہمیشہ اِسی میں رہے، اِس لئے لگے ہاتھوں
وہ مکان بھی دیکھ لو جس میں تمہارے اس عظیم شاعر کی زندگی کا
بہت سارا حصّہ گزرا -

اسی گلی میں چند قدم اور چلو - ایک بڑی سی ڈیوڑھی ملے گی
——— اِس کے اندر جاؤ گے تو چھوٹا سا آنگن، پورب کی طرف کو
ایک ذرا بڑا سا کمرہ اور ایک کوٹھری ——— بس یہ اتنا مکان ہے
جس کے بارے میں غالب نے لکھا تھا کہ ان کے " بیٹھنے اُٹھنے،
سونے جاگنے، اور مرنے جینے کا محل ہے "

گلی کی دُوسری طرف وہ جگہ ہے جہاں گھر کی عورتیں رہتی تھیں اور یہ جگہ زنان خانہ کہلاتی تھی۔

اِسی مکان میں دہلی کے تمام شاعر جمع ہُوا کرتے تھے دُوسرے شہروں سے لوگ آتے تو شہر میں سب سے پہلے اِسی گلی کو پُوچھتے اور ڈھُونڈتے ڈھُونڈتے وہاں پُہنچتے ــــ آج بھی جو شخص دہلی آتا ہے وہ گلی قاسم جان کی زیارت کے لئے ضرور جاتا ہے کیونکہ اِسی چھوٹے سے معمولی مکان میں غالبؔ کی اِس شاعری نے جنم لیا جسے بڑے بڑے محلّوں اور شاندار حویلیوں میں رہنے والے اپنی آنکھوں سے لگاتے ہیں!

تُم نے دیکھا ہوگا کہ درخت میں پھَل لگنے کے لئے، پھُول آنے سے لے کر پھَل پکنے تک، سُورج کی روشنی اور گرمی کا کِتنا حصّہ ہوتا ہے۔ اگر سُورج کی تپش نہ پڑے تو پھَلوں میں رنگ اور مٹھاس نہیں آسکتی ــــ تو بس یہی سمجھو کہ غالبؔ کی شاعری کے پھُول تو آگرے میں کھلنے شروع ہو گئے تھے لیکن وہ دہلی کی دُھوپ تھی کہ جس نے اِس میں رنگ اور رس اور مٹھاس بھردیا!

یہاں غالب نے زِندگی کو دیکھا اور پہچانا، سمجھا اور پرکھا۔ نئے نئے دوست ملے، نئے نئے دُشمن، مُغلیہ سلطنت کے دربار میں عِزّت بھی پائی اور مُغلیہ سلطنت کا زوال بھی دیکھا یہیں انھوں نے فاقوں کی مصیبت بھی جھیلی اور عشق کے دُکھ کا بھی پُر لطف مزہ چکھا۔ ان کی شاعری کا مذاق بھی اُڑا اور پھر وہ بچّے بچّے کی زبان پر سُنائی بھی دینے لگی۔ —— زِندگی کی اِس اُتھل پُتھل کی کڑی دھُوپ میں تپ کر غالب کی شاعری پارس بن گئی۔ اور انھوں نے ایسے شعر کہے جو زِندگی کی پرچھائیاں رکھتے تھے، جنھیں پڑھ کر انسان کو اپنی تکلیفیں جھیلنے کی طاقت اور ہمّت ہوتی ہے۔

مثلاً ——

رنج سے خُوگر ہُوا اِنساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مُشکلیں اِتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

یا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یا

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

پانچواں باب

رات کے ایک بجے ہیں!

دہلی کی ایک اندھی گلی میں سے ایک پالکی گزر رہی ہے!

آج کل تو پالکی میں صرف عورتیں بیٹھتی ہیں اور وہ بھی کبھی کبھار لیکن اُنیسویں صدی میں، دہلی اور لکھنؤ کے شریف لوگ اِسی سواری پر چلا کرتے تھے!

اس وقت اس میں کون ہو سکتا ہے؟

دیکھو یہ بلّی ماروں کی طرف مُڑی اور اب گلی قاسم جان کی طرف جا رہی ہے!

ارے اِس میں تو مرزا غالبؔ ہیں!

مگر ان کے چہرے پر یہ رنج اور دُکھ کی پرچھائیاں کیسی؟
کیوں نہ ہو دُکھ — دِل میں کیسے کیسے ارمان لے کر
مشاعرہ میں گئے تھے کہ غزل کی خُوب خُوب داد ملے گی —
پر وہاں مایُوسی اور ناکامی کے سوا کچھ نہ مِلا — یہ اپنے
شعر سُناتے رہے :-

ہے بس کہ ہر ایک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبّت تو گزُرتا ہے گمُاں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جاکر دلِ وجاں اور

—— محفل خامیش رہی !
دو ایک چاہنے والے دوستوں نے تعریف کی، لیکن وہ
کیا دِل کو لگتی !
آخر وہاں سے اُٹھے، آہستہ سے بولے ۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دِل ان کو جو نہ دے مجھُ کو زباں اور

اور بھری محفل چھوڑ کر نکل آئے۔ یہ ارادہ کر کے کہ اب کسی مشاعرے میں نہیں جائیں گے۔

لیکن دوست کب پیچھا چھوڑنے والے تھے، اُنھوں نے صرف رُوٹھے ہوئے غالب کو منایا ہی نہیں بلکہ انھیں یہ بھی سمجھایا کہ صرف لوگوں کا دِل بدلنے کی دُعا مانگنے سے کام نہیں چلے گا۔ اپنی زبان بھی بدلنی ہوگی۔

مرزا غالب کے اِن دوستوں میں فضل الحق خیرآبادی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا، جنھوں نے غالب کے ساتھ نہ صرف دوستی کا حق ادا کیا بلکہ ہم پر — جو آج غالب کے پڑھنے والے ہیں۔ ہم پر بھی احسان کیا۔ کیونکہ انھوں نے ہی غالب کو ہر وقت کہہ کہہ کر یہ سمجھایا کہ ایسے شعر کہو کہ جن کو لوگ پسند کریں۔ ورنہ لوگ ضرور تمھارے بارے میں کہیں گے کہ:-

اگر اپنا کہا تُم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دُوسرا سمجھے
زبانِ میرؔ سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خُدا سمجھے

اور تمھاری شاعری چلے گی نہیں۔ بے شک جو شاعر ہوتا ہے وہ دِل کا خُون کر کے شعر کہتا ہے لیکن آخر وہ کہتا تو ہے دُوسروں ہی کو سُنانے کے لئے ـــــ پھر اگر تمھاری بات کہنے کا طریقہ ایسا ہو کہ سُننے والوں کے دِل کو وہ بات نہ لگے تو تمھارا شعر کہنا کیا معنی؟

غالبؔ کے یہ دوست بات تو بہت ہی ٹھیک کہتے تھے مگر اِس بات کو ماننا کِس قدر دُشوار تھا اس کا اندازہ تمھیں عرب کے ایک بہت بڑے مصنّف کی بات سے ہو گا۔

وہ کہتا ہے "شاعر کے لئے اپنی لکھی ہوئی چیزوں کو کاٹنا اُتنا ہی مُشکل ہے جتنا ماں کے لئے اپنے بچّے کے گلے پر چھُری پھیرنا۔ کیونکہ وہ اپنے شعروں سے اتنی ہی محبّت کرتا ہے جتنی ماں اپنے بچّے سے کرتی ہے۔"

اِس بات کو سمجھنے کے بعد تُم مرزا غالبؔ کی ہمّت کی داد دو! ذرا یہ سوچو کہ اپنے دوستوں کی اِس رائے کی سچائی کو انھوں نے صرف مانا ہی نہیں بلکہ اِس پر عمل کرتے ہوئے اپنے دیوان کو جب چھانٹا تو اس کا تقریباً تین چوتھائی حِصّہ کاٹ کر

پھینک دیا۔

اِس کے یہ معنی ہوئے کہ انسان کی جو سب سے بڑی خوبی ہے یعنی اپنی کمیوں اور کمزوریوں کا ماننا اور پھر اپنی طبیعت پر جبر اور دباؤ ڈال کر اِن کمزوریوں کو دُور کرنا —— یہ خوبی مرزا غالبؔ میں کِس درجہ تھی!

یہی وجہ ہے کہ اگر تم دیوانِ غالبؔ کو دیکھو تو حیران رہ جاؤگے کہ اِتنی چھوٹی سی کتاب اور اِس کی اِتنی شُہرت! لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غالبؔ کی نظر جوہری کی تھی، ایک ایماندار اور سچّے فن کار کی نظر تھی —— انھوں نے صرف ہیرے چُن لئے اور کنکر سب نکال ڈالے!

اِسی لئے یہ چھوٹی سی کتاب بھاری بھاری دیوانوں کے مقابلے میں زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اِس زمانے میں دہلی میں کچھ خاص لوگوں کا ایک گٹھ تھا جو غالبؔ کی بڑھتی ہوئی شُہرت سے جلتے تھے اور ہر ممکن کوشش اور طرح طرح کی ترکیبیں کیا کرتے تھے کہ غالبؔ کا

کلام نہ چلنے پائے۔ لیکن عام لوگ ان کی غزلوں کو بہت پسند کرتے تھے۔

عام لوگوں کی اِس پسند کے بارے میں بھی طرح طرح کی دِلچسپ باتیں مشہور رہیں۔

ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چاندنی چوک میں ایک طوائف رہتی تھی جس کا نام چودھویں تھا۔ یہ بڑی خوبصورت اور سجیلی عورت تھی اور اسے گانا بجانا بھی خوب آتا تھا۔ دہلی کے اکثر خاص و عام اس کے یہاں گانا سُننے جایا کرتے تھے۔

چودھویں کو مرزا غالب کی شاعری بہت پسند تھی اور وہ آئے دِن نئی نئی دُھنیں بنا کر ان کی غزلیں گایا کرتی تھی۔ ہوتے ہوتے مرزا غالب کی غزلیں دہلی کے تمام گلی کوچوں میں پھیل گئیں۔ اور پہنچتے پہنچتے مرزا غالب تک بھی یہ بات پہنچ گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مرزا غالب اِس بات پر بہت رنجیدہ اور غمگین تھے کہ ان کی شاعری خاص لوگوں میں پسند نہیں

کی جارہی تھی۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ اپنی شاعری کی اِتنی قدر کرنے والی عورت سے ملنے کی خواہش مرزا کے دِل میں ضرور پیدا ہوئی ہو گی۔

اور پھر مرزا اور چودھویں میں محبّت ہو گئی!

اپنی اِس محبّت کا حال مرزا نے کبھی کُھلّم کُھلا نہیں بیان کیا۔ لیکن ان کے خطوط میں کہیں کہیں اِس کا اُڑتا اُڑتا سا ذکر ہے۔

تم نے اگر "مرزا غالب" فلم دیکھی ہو گی تو اس میں اس محبّت کا پُورا حال دکھایا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ چودھویں کا اِنتقال جوانی ہی میں ہو گیا۔

مرزا غالب کے کچھ شعر ایسے ملتے ہیں جن کے بارے میں یہ سوچا جا سکتا ہے کہ انھوں نے چودھویں کی اس بے وقت موت پر کہے ہوں گے۔

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دُشمنی اپنی تھی، میری دوستداری ہائے ہائے

شرمِ رُسوائی سے جا چھُپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
عُمر بھر کا تُو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عُمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

اور اُن کی وہ بہت مشہور اور خوبصورت غزل :-

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہُوا میرے بعد
آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ
کِس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

مرزا غالبؔ اور چودھویں کی محبّت کی یہ کہانی بڑی دُکھ بھری ہے اور اِس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فنکار کا دل محبّت کا بڑا پیاسا ہوتا ہے اور اِس کی سب سے بڑی آرزو اور سب سے پیاری تمنّا یہ ہوتی ہے کہ اِسے کوئی ایسا شخص ملے جو اُس کے فن کا سچّا قدر دان ہو، اُسے سمجھے اور اِس سے پیار کرے۔ اکثر فن کاروں کو اپنے گھروں میں یہ بات نہیں نصیب

ہوتی تو وہ گھر کے باہر کسی سے پیار کرتے اور اپنا دِل بہلاتے ہیں، اپنے فن میں اپنے اِس دُکھ کی تصویریں کھینچتے ہیں اور شراب کے نشے میں اپنے اِس غم کو بھُول جانے کی کوشِش کرتے ہیں۔ جیسے غالب نے لِکھا ہے :۔

مَے سے غرض نشاط ہے کِس رُوسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دِن رات چاہیئے

ہم سب کو چاہیئے کہ ایسی کوشش کریں کہ کلاکار کے نرم اور نازک دِل کو سماج کی ٹھوکریں نہ لگیں اور اس کے فن کی ایسی ہی قدر ہو جیسی کہ ہونی چاہیئے۔

چھٹا باب ۶

دہلی سے لکھنؤ جانے والی سڑک پر ایک گھوڑا گاڑی جا رہی ہے!

برسات کا موسم ہے، پُھوار پڑ رہی ہے، چاروں طرف ہریالی چھائی ہے، جوہر گڑھے پانی سے بھرے ہیں۔ آموں کی خُوب بہار ہے۔ جدھر دیکھئے ٹوکروں میں زرد زرد آم بھرے ہوئے سڑک کے کنارے لگے ہیں، دوکانوں پر سجے ہیں، پیڑوں سے ٹپک رہے ہیں ــــ اور آم بھی کیسے، دسہری، سفیدہ ــ جن کی مٹھاس بقولِ مرزا غالب:-

"انگبیں کے ہیں سر بہ مُہر گلاس"

لیکن دسہری اور سفیدہ تو لکھنؤ کے آم ہوتے ہیں ؟

تو اور کیا ؟ — یہ لکھنؤ تو ہے ہی !

اِس گھوڑا گاڑی میں مرزا غالب دہلی سے لکھنؤ پہنچ رہے ہیں۔

غازی الدین حیدر کا زمانہ ہے، لکھنؤ میں اُردو کی شعر شاعری اپنے پورے شباب پر پہنچی ہوئی ہے۔ لوگوں کو معلوم ہُوا ہے کہ مرزا غالب لکھنؤ آئے، ان کی خوب خاطر مدارات ہو رہی ہے جگہ جگہ مشاعرے ہوتے ہیں۔ لوگ اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔

لو اب شمع مرزا کے سامنے آئی۔

لگے ہاتھوں تمہیں اس شمع کا بھی حال سُنا دیں! بات یہ ہے کہ اس زمانے میں اچھے مشاعرے بڑے اہتمام سے ہُوا کرتے تھے۔ فرش پر بڑے بڑے نرم اور قیمتی قالین، ان پر سفید دُودھ سی چاندنیاں، چاروں طرف گاؤ تکیئے جن پر سفید اُجلے غلاف چڑھے، بیچ بیچ میں چاندی کے حُقّے، کلابتو لپیٹی ہوئی سٹک لگی۔ چاندی کے خاصدان جن میں بھیگے ہوئے سُرخ ریشم میں لپٹی ہوئی پان کی

گلوریاں، چاندی کے ورق لگے، الائچی پڑی، چاندی کے گلاب پاشوں میں عرقِ گلاب، طشتریوں میں چکنی ڈلی، الائچی وغیرہ رکھی۔ —— اُوپر شامیانہ سے لٹکتے ہوئے پھولوں کے دربازے ۔ چاروں طرف طاقوں میں روشنی کے لئے کنول روشن، شمعیں جل رہی ہیں، شامیانے میں جھاڑ فانوس، قندیلیں لٹک رہی ہیں!

غرض کہ اک عجب سماں ہوتا تھا!

جب سب شاعر جمع ہو جاتے تو بیچ میں ایک چھوٹی سی چاندی کی لگن لاکر رکھی جاتی، اِس کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی شمع ہوتی تھی۔ شمع کے چاروں طرف کیوڑہ بھرا رہتا تھا۔

جب مشاعرہ شروع ہوتا تو یہ شمع روشن کردی جاتی اور جس شاعر کی باری ہوتی اس کے سامنے رکھ دی جاتی۔ شمع سامنے آتے ہی شاعر سنبھل کر بیٹھ جاتا اور اپنا کلام شروع کرتا۔

تو اب شمع مرزا غالبؔ کے سامنے ہے!

ذرا سُنو کیا کہتے ہیں:۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوُچے سے ہم نکلے

کہاں مے خانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

لوگ ہیں کہ سُنتے نہیں تھکتے! بار بار فرمائشیں ہوتی ہیں اور وہ بار بار سُناتے ہیں۔

نکتہ چیں ہے غمِ دِل اِس کو سُنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

مَیں بُلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دِل
اُس پہ بَن جائے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لئے یوُں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پُوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے

ایک مُلازم باہر سے آکر اطّلاع دیتا ہے کہ آغا میر صاحب کے یہاں سے کوئی صاحب مرزا غالبؔ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ جن صاحب کے گھر مشاعرہ ہے۔ وہ ٹھہرنے کو کہتے ہیں کیونکہ مرزا ۶ حاضرین کے اِصرار پر تیسری غزل کے کچھ شعر سُنا رہے ہیں:۔

عِشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شُہرت ہی سہی
قطع کیجیئے نہ تعلّق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی دُشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبّت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسؔد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

محفل برخاست ہوتی ہے!

مرزا شاعروں کے جُھرمٹ میں باہر نکلتے ہیں۔ جو صاحب انتظار میں کھڑے تھے انھوں نے بندگی عرض کرکے بتایا کہ آغا

میر نے بھیجا ہے کہ مرزا غالب سے کہنا ہم ان سے مل کر خوش ہوں گے۔ — درصل غازی الدین حیدر تو نام کے بادشاہ ہیں، سب کرتا دھرتا، مالک مختار تو یہی آغا میر ہیں۔

غالب کا جواب بھی ذرا سنو۔ کہتے ہیں "میں خوشی سے آؤں گا لیکن دو شرطوں کے ساتھ، اوّل تو یہ کہ میں نقد نذر نہیں پیش کروں گا اور دوسرے یہ کہ جب میں پہنچوں تو آغا میر کھڑے ہو کر میرا استقبال کریں"

نتیجہ وہی ہوا کہ نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا ناچیں گی۔ نہ انھوں نے غالب کی شرط مانی اور نہ غالب ان کے یہاں گئے۔

اور یہ اُس زمانے کی بات ہے جب غالب کی مالی حالت بہت خراب تھی، روپئے کی بہت تنگی تھی —— اور یہ دستور بھی تھا کہ شاعر لوگ درباروں میں حاضریاں دیا کرتے تھے۔

آج نہ آغا میر زندہ ہیں اور نہ مرزا غالب، لیکن ہم اور تم یہ ضرور جانتے ہیں کہ مرزا غالب جیسے شاعر چاندی اور سونے کے مول اپنے شعر نہیں بیچا کرتے۔ ان کا معیار اور ہی کچھ ہوتا ہے۔

غالب ایک جگہ لکھتے ہیں :-

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سُخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

یعنی کہتے ہیں کہ اگر ہمارے خریدار کی طبیعت ہمارے فن کی سچی خریدار رہے تو ہم اس کے ہاتھ اپنا شعر بیچنا تو کیسا اپنے آپ کو بھی بیچ دیتے ہیں !

لکھنؤ میں کئی مہینے رہنے کے بعد مرزا غالب کلکتہ گئے۔ یہ سفر بھی زیادہ تر گھوڑا گاڑی سے طے ہُوا، کچھ ناؤ سے بھی ـــ کلکتہ پہونچ کر شملہ بازار میں ایک چھوٹا سا مکان لیا جو کافی کھُلا ہُوا تھا اور ہوا دار ـــ آرام کا تمام سامان اِس میں موجود تھا۔ آنگن کے ایک کونے میں میٹھے پانی کا کنواں بھی تھا۔

وہ انگریزوں کا زمانہ تھا، گورنر جنرل کلکتے میں رہا کرتا تھا اور اُسی کے یہاں غالب کو کام تھا۔

بات یہ تھی کہ مرزا غالب کو موروثی حیثیت سے کچھ پنشن ملتی تھی جو تقریباً ساڑھے سات سَو روپیہ سالانہ تھی۔ یعنی کوئی ساٹھ

روپیہ ماہوار ہوئی ! مرزا یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ پنشن بڑھ جائے کیونکہ ظاہر ہے کہ اِس میں اُن کی گذر ہوئی مشکل تھی۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ پنشن کا روپیہ اِن کو سیدھا سرکار سے ملا کرے کیونکہ جن نوابوں کے ذریعے یہ روپیہ مِلا کرتا تھا اُن کی خوشامد کرنا مرزا کو پسند نہ تھا۔

کئی سال یہ مقدّمہ چلتا رہا۔ مرزا نے بہت سا روپیہ قرض بھی لے کر اس میں لگایا کہ جب پنشن بڑھ جائے گی تو اس میں سے ادا کر دیں گے۔ ولایت تک یہ مقدّمہ گیا لیکن آخر میں مرزا غالب جیت نہ سکے۔ اُلٹے ان کے اُوپر قرض بہت سا ہو گیا جو وہ آخر عُمر تک چُکاتے رہے اور اس کی وجہ سے بہت پریشان رہے۔

ویسے کلکتہّ شہر ان کو پسند بہت آیا۔

لگ بھگ تین سال کے قریب وہ وہاں رہے اور کلکتہّ شہر کی تعریف میں انھوں نے شعر بھی کہے اور خطوں میں بھی جہاں کہیں اس کا ذکر کیا، تعریف اور محبّت کے ساتھ۔

دیکھو یہ اُن کے دو تین شعر کلکتہّ کے بارے میں ہیں۔

کلکتے کا جو ذِکر کیا تُو نے ہم نشیں
ایک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مُطرّا کہ ہے غضب
وہ نازنین بُتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

سمجھے تُم
کہتے ہیں کہ ہائے وہ سرسبز دوب کے تختے کہ جن سے دِل کو ٹھنڈک اور تراوٹ ہو —— اور اس پر ٹہلتی ہوئی وہ خوب صورت اور نازنین، مُورتیوں کی سی حسین عورتیں، اپنے آپ کو بنائے سجائے، اپنا سنگھار اور اپنی سجاوٹ دکھاتی اور دلوں کو لُبھاتی!

اور پھر کہتے ہیں :-

وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

وہ تازے اور رسیلے اور میٹھے پھل، وہ لال لال، شیریں اور مزے دار شراب کہ جس کو پی کر دِل باغ باغ ہو جائے۔

کہو —— آنکھوں کے سامنے کلکتے کی تصویر کھنچ گئی نہ؟

—— اپنے خطوں میں بھی غالب نے کئی جگہ کلکتہ کا ذِکر کیا ہے
اور ہمیشہ بہت پیار سے کیا ہے!

لیکن کلکتے نے غالب کو یہی کچھ نہیں دکھایا جو تم نے اُوپر پڑھا۔ بلکہ کاروباری شہر میں جاکر، بڑے شہر میں رہ کر انسان جو کچھ سیکھتا ہے وہ بھی سکھایا!

وہاں جاکر مرزا غالب کے بہت سے گلے بندھے خیالات بدل گئے اور نئے خیالات نے ان کی جگہ لے لی۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ اِنسان کس طرح ایک نئی زندگی کی طرف بڑھ رہا ہے اُن کو زندگی کی خوبصورتی کا زیادہ احساس ہُوا اور زندگی کی مضبوطی پر زیادہ بھروسہ!

کلکتے سے واپس آکر غالب کی شاعری میں ایک نیا موڑ آیا! —— ان کی بات میں سادگی اور تیزی آگئی اور اس کے یہ معنی تھے کہ ان کے اشعار میں اثر بڑھتا چلا گیا اور وہ چیز آگئی جسے اَدبی زبان میں "تشریت" کہتے ہیں۔ اب انھوں نے ایسے شعر کہنے شروع کیے جو سماج کی پُرانی اور گلی بندھی روایتوں کو

چوٹ پہنچاتے تھے اور نہ مذہب کا نام لینے والوں پر طنز کرتے تھے۔

یہ بات تو تم جانتے ہی ہوں گے کہ ہر سماج میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو مذہب کا اور خدا کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں۔ خود دنیا بھر کی برائیاں کریں تو کچھ نہیں، لیکن دوسروں کو ہر گھڑی نصیحت کرتے رہتے ہیں —— یہ کرو گے تو جنّت میں جاؤ گے اور وہ کرو گے تو جہنّم میں جاؤ گے وغیرہ ——

اچھا اب آزمانے کے لئے تم کسی بھی اچھے شاعر یا فن کار کو دیکھو —— غالب کو لو، تلسی داس کو دیکھو، شیکسپیئر کو پڑھو تو سب کے یہاں تمھیں ایسے جھوٹے لوگوں پر چوٹ ملے گی جو ایمان کے ٹھیکیدار بنتے ہیں!

ایسا کیوں؟

ایسا اِس لئے کہ فن کار چاہے کسی ملک، کسی مذہب اور کسی زبان کا ہو اسے سب سے زیادہ دکھاوے سے نفرت ہوتی ہے، وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان جیسا ہو ویسا ہی نظر آئے، مکّاری اور دھوکہ بازی نہ کرے —— آدمی سب ایک

دُوسرے سے پیار کریں ۔ لوگ خود بھی خوش رہیں اور دُوسروں کو بھی خوش رہنے دیں ۔

اب تم سوچو کہ جب غالب نے کہا ہوگا :-

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خُدا رکھتے تھے

یا

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

یا

جلّاد سے ڈرتے ہیں ، نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

یہ واعظ وہی صاحب ہیں جو سمجھتے ہیں کہ جنّت میں سیٹ بُک کرانا صرف ان کا کام ہے !

مزے کی بات یہ ہوتی ہے کہ یہ 'واعظ' قسم کے لوگ تو ایسے شعر کہنے والوں کے دشمن ہو جاتے ہیں

لیکن عام لوگ ان فن کاروں کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اور ان کو اپنے دلوں میں اور اپنی زبانوں پر زندہ رکھ کر امر بناتے ہیں! کیونکہ تم غور کرو تو تمھیں یہ نظر آئے گا کہ عام لوگ سچائی کے پرستار ہوتے ہیں اور ان کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ نصیحت کرنے والے دوسروں کو بے وقوف بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کر رہے ہیں۔

چنانچہ ایک بار مرزا غالب بھی ان لوگوں کی دشمنی کا شکار ہوئے!

وہ کیسے؟

یہ ہم تمھیں آگے بتائیں گے!

اس وقت تو ہم تمھیں ایک واقعہ ایسا اور بتاتے ہیں جس سے تمھیں معلوم ہو گا کہ غالب کتنے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے اور انھیں اپنی عزت کتنی پیاری تھی!

یہ تو تمھیں معلوم ہے کہ جب غالب لکھنؤ اور کلکتے گئے تھے تو ان کو پیسوں کی سخت ضرورت تھی، ـــــ دہلی میں اس زمانے

میں ایک کالج ہُوا کرتا تھا جس کا نام "دہلی کالج" تھا۔ جب مرزا کلکتّے سے واپس آئے تو وہاں ایک بڑے اُستاد کی ضرورت تھی۔ فارسی پڑھانے کے لئے۔ ٹامسن صاحب جو اِس کالج کے کرتا دھرتا تھے انھوں نے مرزا غالب کو بلایا۔ یہ پالکی پر سوار ہو کر اُن کے بنگلے پر گئے ——

اب بنگلے کے دروازے پر پالکی کھڑی ہے کہ کوئی لینے آئے تو اُتریں۔ جب کِسی نے اِن سے کہا کہ "حضرت، تشریف لائیے" —— تو کہا کہ "صاحب کوئی مجھے اُتروانے آئے تب تو اُتروں" —— یہ بات چیت ہو رہی تھی کہ ٹامسن صاحب خود نکل آئے اور بات معلوم کر کے کہنے لگے کہ "آپ نوکری کے لئے آئے ہیں، کوئی مُلاقات کے لئے تو آئے نہیں ہیں، اِس لئے کوئی آپ کو لینے کیسے آتا۔"

مرزا نے —— جواب دیا "جناب —— میں تو سمجھا تھا کہ اِس نوکری سے میری عزّت بڑھے گی لیکن یہاں تو یہ دکھائی دے رہا ہے کہ جو رہی سہی عزّت ہے وہ بھی ہاتھ سے جائے گی۔

بس — ایسی نوکری کو سات سلام"۔

پالکی میں بیٹھے ہی بیٹھے کہاروں کو حکم دیا کہ "واپس لوٹ چلو"۔

اِس زمانے میں غالب نے کچھ شعر اپنی غریبی کے بارے میں کہے ہیں۔ مثلاً —

ہم نے مانا یہ کہ دہلی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟

یا

غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

اِس طرح کے اشعار کو پڑھ کر دِل دُکھ جاتا ہے اور یہ خیال آتا ہے کہ کاش سماج میں ایسا بندوبست ہو سکتا کہ فن کار اپنی دال روٹی کی فکر سے آزاد ہو کر اطمینان سے شعر کہہ سکتا، تصویریں بنا سکتا، مورتیاں گھڑ سکتا تو کِتنا اچھا ہوتا اور دُنیا کی خوبصورتی اور اچھائی کِس قدر زیادہ بڑھ جاتی!

ساتواں باب

ہاں وہ مرزا غالب کی دشمنی والی بات تو رہ گئی!

ہُوا یُوں کہ اس زمانے میں سب ہی کے یہاں چوسر اور شطرنج کھیلی جاتی تھی۔ مرزا نے بھی بچپن میں یہ کھیل سیکھے تھے اور کبھی کبھی اپنے گھر پر کھیلا بھی کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کھیل اکیلے تو نہیں کھیلے جاتے اِس لئے دو چار دس دوست بھی اکٹھے ہوتے تھے۔

اس زمانے میں دہلی کے کوتوال صاحب جو نئے بدل کر آئے تھے اُن کا نام فیض الحسن تھا۔ یہ واعظ، قِسم کے آدمی تھے انھوں نے مرزا غالب کو جُوئے کا اڈا قائم کرنے کے الزام میں

گرفتار کر لیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرزا اس زمانے میں کئی مہاجنوں کے قرض دار تھے اور ان کی گرفتاری میں ان مہاجنوں میں سے بھی کسی کا ہاتھ تھا!

اب یہاں پر تم یہ بھی ضرور سوچو کہ فنکار کے بارے میں یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اس میں کوئی کمزوری یا بُرائی ہوگی ہی نہیں — آخر وہ بھی تو ہماری تمہاری طرح کا ایک اِنسان ہے پھر اس میں کِسی طرح کی کِسی وقت کمزوری کیوں نہ آئے؟

سچ کہنا کیا کبھی ہمارا جی نہیں چاہتا کہ کسی طرح ایک دم سے بہت سارا روپیہ ہمارے پاس آجائے' — چاہتا ہے نا؟ کبھی کبھار ہم بھی تو سوچتے ہیں کہ لاؤ دس روپے کا لاٹری کا ٹکٹ خرید کر بھیج دیں شاید ایک لاکھ مِل ہی جائے! پھر اگر کوئی فن کار یا شاعر اِس طرح کبھی سوچے تو اس کو خاص کر کیوں بُرا کہا جائے — یا یہ سوچا جائے کہ ایسا کرنے سے اس کے فن پر کوئی دھبّہ لگ گیا۔

اچھا تو کوتوال صاحب کو یہ بھی معلوم تھا کہ مرزا شراب

پیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مرزا کے وہ اشعار جو انھوں نے واعظ قسم کے لوگوں پر کہے ہیں ۔۔ اور بڑا مزہ لے لے کر کہے ہیں، وہ تو ان کو قوال صاحب نے پڑھے ہی ہوں گے ! ۔۔ بس کڑوا کریلا اور نیم چڑھا !

انھوں نے غالب صاحب کو دھر لیا !

جہاں تک شراب پینے کا سوال ہے، غالب پیتے ضرور تھے اور یقیناً شراب پینا کوئی اچھی بات نہیں ہے ۔ لیکن اوّل تو وہ بہت کم پیتے تھے، ان کا شراب پینا خاندان یا محلّے والوں کے لئے کوئی پریشانی کا باعث تو تھا نہیں ۔۔ دُوسرے یہ کہ وہ کبھی چھُپا کے نہیں پیتے تھے ۔۔ جو اُن کے باطن میں تھا وہی ظاہر میں ۔۔ اِس لئے وہ ان لوگوں سے یقیناً بہتر انسان تھے جو اُوپر اُوپر تو اپنی پاکیزگی کا ڈھول پیٹتے ہیں اور اندر اندر اس ڈھول میں پول ہوتا ہے ۔

ہم تو بھئی یہی سمجھتے ہیں کہ جو شخص ذراسی پی لیتا ہے وہ اِتنا بُرا نہیں ہوتا جتنا وہ جو دُوسروں کو تکلیفیں پہنچاتا ہے، جھُوٹ

بولتا اور دکھاوا کرتا ہے۔ جو اندر کچھ اور ہوتا ہے باہر کچھ اور!

مرزا غالب کو چھ مہینے کی سزا ہوئی! دو سَو روپیہ جُرمانہ!

ان کی گرفتاری پر شہر میں کافی ہنگامہ ہُوا، عام لوگوں نے مخالفت کی، اخباروں میں مضمون لکھے گئے، دوستوں نے سفارشیں پہنچائیں، دَوڑے بھاگے۔ لیکن ایک طرف تو کوتوال اور انگریزوں کا مجسٹریٹ ایسا ایک ہوئے کہ کچھ کامیابی نہ ہوئی اور مرزا کو قید خانے میں جانا پڑا۔

اگرچہ یہ قید ایسی تھی کہ کھانا کپڑا سب گھر سے جاتا تھا۔ دوست رشتہ دار جب چاہتے ملنے جا سکتے تھے۔ لیکن قید پھر قید تھی!

مرزا نے قید میں بھی شعر کہے، بہت بہت اچھے شعر، ایک دو تم بھی سُنو——

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یُوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چُھٹ جائیں گے کیا

یا

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دِن

یا

حیف اِس چارہ گر کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

تین مہینے کے بعد مرزا کے دوستوں آزردہؔ اور شیفتہؔ نے دَوڑ بھاگ کر کے دہلی کے سول سرجن ڈاکٹر راس کے یہاں سفارشیں پہنچوائیں۔ انھوں نے مرزا کو رہا کرا دیا!

جب وہ جیل سے رہا ہوئے تو ان کے دوستوں نے سوچنا شروع کیا کہ مرزا کی گزر بسر کرنے کے لئے کوئی معقول اور مُستقل اِنتظام کرنے کی فوراً ضرورت ہے ورنہ یہ پھر کوئی رنگ لائیں گے، اور آئے دِن یہی قصّے کھڑے ہوتے رہیں گے۔

اس وقت جو مُغل بادشاہ تھے اُن کا نام ابوظفر بہادر شاہ تھا۔ ان کے ایک پیر صاحب تھے جو کالے میاں کے نام سے مشہور تھے حالانکہ ان کا اصل نام نصیرالدین تھا —— دہلی میں

اب تک گلی قاسم جان کے پاس، کالے صاحب کا حاطہ موجود ہے۔ تو یہ کالے صاحب اور ایک صاحب حکیم احسن اللہ تھے جو تاریخ کے بڑے عالم تھے ان دونوں نے مِل کر غالب کو شاہی قلعہ میں نوکر رکھوانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

کالے صاحب کے ذکر پر ایک لطیفہ یاد آیا! جب قید سے رہا ہوئے تو یہ ان کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے، بہت دِن رکھا خاطر مدارات کی۔ لیکن غالب تھے آزاد مزاج اور وہاں چاروں طرف مذہبی رنگ چھایا ہُوا۔ آخر پیر صاحب ہی کا تو گھر تھا۔ تو غالب بے چارے بہت گھبراتے تھے۔ ایک صاحب وہاں ان سے ملنے کے لئے آئے اور بولے "شکر ہے کہ آپ قید سے رہا ہوئے"

مرزا چُپکے سے بولے "کون بھڑوا قید سے آزاد ہُوا ہے؟ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں"

خیر، تو ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو غالب بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے۔ اُن کے سپرد ایک خاص کام یہ کیا گیا کہ حکیم احسن اللہ، تیموری خاندان کے حالات، بہت سی کتابوں سے ایک جگہ اکٹھا

کریں اور غالب اِن حالات کو اپنی خاص طرز میں فارسی نثر میں لکھیں۔

یہ نوکری تو ٹھیک تھی، قلعہ میں لوگ غالب کی عزّت بھی کرتے تھے لیکن ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ وہاں تنخواہ ہر چھ ماہ کے بعد بٹتی تھی روزانہ کے خرچ کے لئے اُدھار لینا پڑتا تھا۔ غالب نے ایک درخواست نظم میں کہہ کر بادشاہ کے یہاں بھیجی۔

اِس نظم میں بہت سے شعر ہیں لیکن ہم تمھیں صرف دو چار ہی سُناتے ہیں، پُوری پڑھنے کا شوق ہو تو دیوانِ غالب دیکھنا۔

میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آگ تاپے کہاں تلک انساں — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار
تُم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

کیسے افسوس کی بات ہے کہ غالب ایسے کلاکار کو اپنی گزر بسر کے لئے ایسے شعر بھی کہنے پڑتے تھے۔

آٹھواں باب

دِلّی اور دلّی والوں کے لئے ۱۸۵۷ء کا سال اور اِس سال مئی کا مہینہ قیامت کا زمانہ تھا۔

تم کو تو معلوم ہوگا اِس زمانے میں غدر ہوا تھا!

پہلے ہندوستانیوں نے دہلی پر قبضہ کیا اور بہادر شاہ ظفر کو باقاعدہ بادشاہ بنا دیا۔ لیکن پانچ مہینے بعد ستمبر ۱۸۵۷ء میں، دہلی میں انگریزوں کا قبضہ پھر سے ہُوا۔

اِس اُتھل پُتھل سے پہلے تو بہت سے انگریز مارے گئے اور پھر جب انگریز واپس آ گئے تب ہندوستانیوں پر ظُلم کی کوئی حد نہ رہی بادشاہ قید کرکے رنگون بھیج دئے گئے۔ شاہی خاندان کے

بہت سے لوگوں اور اُن کے بے شمار ساتھیوں اور دوستوں کو پھانسیاں دی گئیں، گولیاں ماری گئیں ——— اور عام لوگوں میں جو لُوٹ کھسوٹ، مار دھاڑ اور قتلِ عام ہُوا، اِس کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔

مرزا غالبؔ اس وقت بلّی ماروں میں رہتے تھے!

جیسے ہی فساد شروع ہُوا امراؤ بیگم نے اپنے زیور اور کچھ روپے کالے صاحب کے یہاں بھجوا دئیے۔۔۔ کالے صاحب تم کو یاد ہیں نا؟

وہی جو بادشاہ کے پیر تھے! بے چارے روزہ نماز کے علاوہ کسی کے اچھے بُرے میں نہیں تھے اِس لئے امراؤ بیگم نے سوچا ہوگا کہ اُن سے کسی کو کیا دُشمنی ہو سکتی ہے، ہمارا سامان ان کے یہاں رہے گا تو بچ جائے گا۔ لیکن وہ وہاں بھی لُٹ گیا۔

اِس طرح مرزا کی جو تھوڑی بہت پونجی تھی وہ بھی برباد ہوگئی! ان کے اکثر مُسلمان دوستوں پر بھی سخت مصیبتیں آئیں اور یہ حال ہو گیا کہ کسی کو کسی کی خبر نہ رہی! مُسلمانوں پر خاص کر انگریزوں کو

اس لئے شک رہتا تھا کیونکہ بادشاہ مُسلمان تھے اور شاہی خاندان کے بہت سے لوگ اب بھی شہر میں موجود تھے!

لیکن مرزا غالب کے ہندو دوستوں نے اس زمانے میں ان کی بڑی مدد کی۔

میرٹھ سے ہرگوپال برابران کو روپے بھیجتے تھے، منشی ہیرا سنگھ، پنڈت شیورام اور ان کے بیٹے بال مُکند برابر مدد کرتے رہتے تھے۔ مہیش داس اپنے اُستاد کے لئے چھپا چھپا کر شراب بھجواتے رہے۔

مرزا نے ان لوگوں کے بارے میں لکھا ہے "اگر یہ چاروں صاحب موجود نہ ہوتے تو کوئی میری بیکسی کا گواہ تک نہ ہوتا۔"

اسی زمانے میں مرزا پر ایک سخت صدمہ اور گزرا۔ اُن کے بھائی مرزا یوسف محلّہ فراش خانہ میں رہتے تھے۔ غدر میں ان کے بال بچّے جے پور چلے گئے اور وہ اکیلے رہ گئے۔ اِس ہنگامے میں مرزا غالب کے لئے ممکن نہ تھا کہ بھائی کو اپنے پاس بُلوا لیتے۔

ایک دِن معلوم ہُوا کہ گورے ان کے مکان میں گھُس گئے۔ پھر کچھ دن بعد ان کا نوکر کسی طرح بچتا بچا تا مرزا غالب کے یہاں پُہنچا اور ان کو اطلاع دی کہ چار پانچ دِن سخت بُخار میں مُبتلا رہ کر مرزا یُوسف کا انتقال ہو گیا۔

اس وقت مہاراجہ پٹیالہ نے اپنے کچھ سپاہی مرزا غالب کے محلّے پر لگوا دئے تھے کہ محلّہ محفوظ رہے۔ انھوں نے مرزا کو سمجھایا کہ اِس وقت محلّے سے باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔ شہر کی حالت بہت خراب ہے۔ مجبوراً مرزا نے اِن ہی سپاہیوں میں سے ایک سپاہی اور ایک اپنا نوکر۔ اِن دو آدمیوں کو بھیجا۔ بازار تمام بند تھے، کفن کہاں سے مِلتا، مرزا نے اپنے گھر سے دو تین سفید چادریں دیں، ۔ محلّے فراش خانہ کے دو تین آدمیوں نے مِل کر، وہیں ایک چھوٹی سی مسجد کے صحن میں گڈھا کھودا اور یوسف مرزا کو دفن کر دیا۔

مرزا غالب اپنے مرنے والے بھائی کی صُورت بھی نہ دیکھ سکے! جب دہلی پر انگریزوں کا باقاعدہ قبضہ ہو گیا تو

پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ اِسی پکڑ دھکڑ میں مرزا بھی کرنل براؤن کے سامنے لائے گئے جو چھان بین کر رہے تھے۔ مرزا کے سر پر اس وقت پاپاخی کُلاہ تھی جو صرف مُسلمان پہنتے تھے۔ کرنل براؤن نے پُوچھا "ویل۔ تم مُسلمان ہے؟"

اور کوئی ہوتا تو اس کی سٹّی گم ہو جاتی۔ لیکن دیکھو مرزا نے اپنی چنچل طبعیت کی وجہ سے کیسی بازی جیتی ___ فوراً جواب دیا۔ "جی ہاں۔ مگر آدھا!"

کرنل نے حیران ہو کر پُوچھا "اِس کا مطلب"۔

مرزا بولے "میں شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا"

کرنل ہنسنے لگا۔

پھر مرزا نے اُن کو وزیرِ ہند کی چِٹھی دکھائی!

کرنل نے پُوچھا "انگریزی سرکار کی جیت کے بعد پہاڑی پر کیوں نہیں حاضر ہوئے" ___ ؟

مرزا نے جواب دیا "میں چار کہاروں کا افسر تھا، وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے ___ کیسے آتا" ___ یعنی پالکی میں

چلتے تھے، جب کہار نہ رہے تو پالکی کیوں کر چلتی اور پالکی نہ چلتی تو مرزا کیونکر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے۔

مرزا کا خیال تھا کہ انگریز شاید ان کا وظیفہ پھر سے جاری کر دیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا اور غدر کے بعد مرزا کی مالی حالت اور تباہ ہو گئی، پیسے پیسے کا رونا پڑ گیا!

ایک خط میں لکھتے ہیں "اس غریبی کے زمانے میں جس قدر کپڑا، پہننا، اوڑھنا اور بچھونا گھر میں تھا، سب بیچ بیچ کر کھالیا۔ گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔"

آخر رام پور کے نواب یوسف علی خاں نے سو روپیہ ماہوار مقرر کیا جو اُن کو آخر دم تک ملتا رہا۔ نواب ضیاء الدین احمد نے ان کی بی بی امراؤ بیگم کے نام سے پچاس روپیہ مہینہ وظیفہ مقرر کیا یہ بھی آخر تک ان کو ملتا رہا! غدر کے تین سال بعد کہیں جا کر سرکاری پنشن جاری ہوئی۔

اس سرکاری پنشن کے جاری کرانے میں سر سید احمد خاں نے بڑی کوشش کی۔

سر سید کا نام تو تم نے سنا ہی ہو گا۔ وہی جنہوں نے علیگڑھ یونیورسٹی قائم کی تھی!

غالب اور سر سید کا ایک بڑا مزے دار چٹکلہ بھی سنو!

مرزا غالب ایک بار رام پور سے دہلی واپس آتے ہوئے مراد آباد میں ٹھہرے۔ سر سید وہیں تھے، ان کو پتہ چلا تو غالب کو سرائے سے اٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ سامان کے ساتھ شراب کی بوتل بھی تھی۔ سر سید نے جہاں ان کا سامان رکھا وہاں یہ شراب کی بوتل نہیں رکھی بلکہ اندر لے جا کر کہیں کسی کوٹھری میں رکھ دی۔ غالب نے بوتل سامنے نہیں پائی تو پوچھا کہ میری بوتل کیا ہوئی؟ سر سید نے اطمینان دلایا کہ حفاظت سے اندر کوٹھری میں رکھی ہے۔ لیکن غالب کو اطمینان نہ ہوا، کہا دکھاؤ کہاں رکھی ہے۔ اس پر سر سید نے ان کو ساتھ لے جا کر کوٹھری میں رکھی ہوئی بوتل دکھائی —— مرزا نے بوتل ہاتھ میں لی اور گھما پھرا کر بولے۔

"اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے۔ سچ بتاؤ کس نے پی ہے؟"

سر سید بے چارے روزہ نماز کرنے والے اور داڑھی

رکھنے والے نیک مسلمان آدمی تھے۔ کانوں پر ہاتھ رکھنے اور توبہ تلّا کرنے لگے! ——— لیکن غالب نے ان کو خوب چھیڑا۔ بار بار کہتے "ارے بھئی! ——— پی لی تو کوئی بات نہیں پر کم از کم ہم کو تو بتا دو چھپا نہیں سکتے ہو کیونکہ پینے والے کی بوتل میں سے تو ایک قطرہ بھی کم ہو جاتا تو اس کو پتہ چل جاتا ہے۔ آخر بوتل ہی کیوں کوٹھری میں رکھی، کوئی اور سامان کیوں نہ رکھ دیا"۔

سرسید بے چارے کبھی روہانسے ہوتے، کبھی ہنستے! غرضکہ خوب دِل لگی رہی!

رام پور سے واپس آتے ہوئے ایک بار مرزا غالب پر ایک عجیب سی مصیبت آئی تھی۔

جاڑے کا زمانہ تھا، مہاوٹوں کی بارش ہو رہی تھی، رام گنگا میں طغیانی آئی ہوئی تھی، دریا پر کشتیوں کا ایک کمزور پل بنا ہوا تھا۔ مرزا غالب دریا پار کر رہے تھے، جیسے ہی ان کی پالکی اس پار پہنچی، ایک زبردست لہر پانی میں اُٹھی اور کشتیوں کے کمزور پُل کو اپنے ساتھ بہا لے گئی ——— اور اب نوکر چاکر، سامان

اسباب تو اِس کنارے پر اور ہمارے شاعر صاحب اُس کنارے پر اور بیچ میں دریا زوروں سے ٹھاٹھیں مار رہا ہے!

بڑی مُشکل سے ایک سرائے میں پُہنچے اور ایک رات وہاں بِتائی۔ صبح کو مولوی محمد حسن خاں صاحب کو پتہ چلا، وہ اس وقت مرادآباد میں صدر الصدور تھے۔ یہ عُہدہ کچھ ایسا ہوتا تھا جیسے آج کل مجسٹریٹ یا جج ہوتا ہے۔ وہ دَوڑے ہوئے اِس سرائے میں پہنچے اور اپنے یہاں لے گئے۔ کئی دِن بڑے احترام اور خاطر سے اپنے یہاں رکھا۔

نواب کلب علی خاں کو خط میں لِکھا۔

"..... بعد پالکی کے اُتر آنے کے پُل کا ٹوٹ جانا، گاڑی، اسباب یہاں تک کہ اوڑھنے بچھونے کا مع آدمیوں کے رہ جانا، سوائے جاڑے کے کچھ نہ کھانا..... مَیں مرادآباد کی ایک چھوٹی سی سرائے میں ٹھیرا، بھُوکا پیاسا، کمبل اوڑھ کر پڑا رہا..... ناگاہ مولوی محمد حسن خاں بہادر آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے..... آپ کے اقبال نے ساتھ دیا ورنہ مَیں اور زندہ دہلی پہنچتا۔"

نواب رام پور ہی سے متعلّق ایک چٹکلہ یہ بھی ہے کہ ایک بار مرزا رام پور سے واپس ہو رہے تھے۔ کسی کو رُخصت کرتے وقت لوگ عام طور پر خُدا حافظ کہتے ہیں اور کہتے ہیں خُدا کو سپرد کیا۔ نواب رام پور نے بھی کہا "آپ کو خُدا کے سُپرد کیا"

غالبؔ نے کہا "حضرت، خُدا نے تو مجھے آپ کے سُپرد کیا اور آپ پھر اُلٹا مجھے خُدا کے سُپرد کرتے ہیں!"

یہاں تک تو تُم نے غالبؔ کی زندگی کے کچھ حالات پڑھے اور اُن کے کچھ شعر سُنے۔ اب ہم تمھیں بتائیں گے کہ غالبؔ نہ صرف شعر لاجواب کہتے تھے بلکہ نثر بھی ایسی لکھتے تھے کہ آج ہم اُن کو صاف اور سلیس اور سادہ و خوبصورت نثر لکھنے کی بُنیاد ڈالنے والوں میں ایک بہت بڑا درجہ دیتے ہیں — وہ کیسے؟

لو — سُنو!

نواں باب ۹

تُم کو یہ تو معلوم ہے نا کہ ہماری زبان اُردو، دُنیا کی تمام زبانوں کی طرح، کئی زبانیں مِلا کر بنی ہے۔

اِس میں سب سے زیادہ ہِندی اور سنسکرت کے —— الفاظ ہیں، پھر فارسی، عربی، انگریزی، پرُتگالی، تُرکی وغیرہ کے الفاظ ہیں ہندوستان کی اور زبانوں مثلاً مرہٹی، تامل، گجُراتی، راجستھانی، اودھی وغیرہ کے الفاظ بھی ہیں۔

لیکن چونکہ ہماری زبان مُسلمانوں کے آنے کے بعد پیدا ہوئی اِس لئے اِس میں فارسی زبان کے الفاظ چھائے ہوئے نظر آتے ہیں، اور چونکہ مُغلوں کی درباری زبان فارسی تھی، اِس لئے

کاروباری کام بھی فارسی میں ہوتا تھا اور درباروں میں پہنچ بھی فارسی زبان کے ذریعے ہوتی تھی۔ چنانچہ جو لوگ اُردو بولتے اور لکھتے پڑھتے بھی تھے اُنھوں نے بھی ان کاموں کے لئے فارسی سیکھی، جن میں ہندوؤں کا کائستھوں اور کشمیری پنڈتوں کا طبقہ خاص طور پر ذکر کے قابل ہے۔

جن لوگوں نے اُردو میں شعر کہے انھوں نے بھی اُردو کی سجاوٹ اِسی میں سمجھی کہ فارسی زبان سے خیالات بھی لئے جائیں اور الفاظ بھی۔ اور جن کا مقصد درباروں میں پہنچنا اور خاص خاص لوگوں سے دوستیاں بڑھانا تھا ان کے لئے تو ظاہر ہے کہ اُردو میں فارسی کا بے حد میل کرنا ضروری تھا ہی!

چنانچہ خاص لوگوں، امیروں، رئیسوں اور درباروں میں زیادہ فارسی ملی ہوئی اُردو پسند کی جاتی تھی! اِس کی مثال تُم اِس طرح سمجھو کہ ابھی دس بارہ سال پہلے جب انگریز یہاں تھے اور سب کاروبار انگریزی میں ہوتا تھا تو وہی شخص پڑھا لکھا اور قابل سمجھا جاتا تھا جو انگریزی زبان اچھی طرح بول سکتا اور

لکھ سکتا تھا!

لیکن مرزا غالبؔ کے بارے میں تم دیکھ چکے ہو کہ وہ اپنا ایک رنگ سب سے الگ رکھتے تھے!

اُن کے اشعار میں تو پھر بھی تمھیں فارسی کافی ملے گی کیونکہ انھوں نے شروع میں فارسی بہت پڑھی بھی تھی اور اس میں شعر بھی کہے تھے اِس لئے وہ اُن کے دماغ میں رچ بس گئی تھی اور زبان پر چھپ گئی تھی۔ لیکن اُنھوں نے اپنے خطوں میں ایسی نثر لکھی ہے جو بہت ہلکی پھلکی اور پیاری تھی —— ہوتے ہوتے یہی زبان لوگوں کے قلم سے نکلنے لگی اور ہر جگہ پھیل گئی۔

آخر زمانے میں مرزا غالبؔ کے اشعار میں بھی بڑی سادگی آ گئی تھی اور وہ اِس طرح کے شعر کہنے لگے تھے:۔

تمُ اُن کے وعدے کا ذِکر اُن سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تمُ کہو، اور وہ کہیں کہ یاد نہیں!

یا

کہا تمُ نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رُسوائی

بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو؟

یا

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے مُنھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یا

بس کہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

یا

نہ تھا کچھُ تو خُدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خُدا ہوتا
ڈبویا مجھُ کو ہونے نے، نہ ہوتا مَیں تو کیا ہوتا

یا

مہرباں ہو کے بُلالو مجھے چاہے جس وقت
مَیں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

اور ایسے ہی بہت سے اور شعر —— جو اگر تمھیں شوق ہو تو
دیوانِ غالب میں دیکھ سکتے ہو!

یہاں پر ہم تمھیں میر نثار علی شہرت سے غالبؔ کی ایک مُلاقات کا حال سُناتے ہیں جِس سے تمھیں پتہ چلے گا کہ زبان کے متعلق غالبؔ کے خیالات کیا تھے۔ لکھتے ہیں ۔

"ایک روز میں مرزا غالبؔ کی خدمت میں حاضر ہُوا، کھانا نوش فرما رہے تھے، مَیں مؤدب ایک طرف بیٹھ گیا، آپ نے ایک سنترہ میری طرف پھینکا کہ اِس سے شغل کیجئے۔ رمضان تھا مَیں نے سنترے کو ہاتھ نہیں لگایا، تاڑ گئے، بولے "ہاں آپ تو مولوی ہیں!" ۔۔۔ جب کھانا کھا چکے تو ایک قلمی رسالہ سامنے رکھا تھا اِس میں کچھ بنانے لگے۔ غالباً ٹھیک کر رہے تھے، مَیں نے عرض کیا "کیا لِکھ رہے ہیں"؟

فرمانے لگے "اِس میں فارسی الفاظ بہت ٹھونس دئے گئے ہیں، اُنھیں نکال رہا ہوں اور ان کی جگہ سیدھے سادے الفاظ ڈال رہا ہوں"

مَیں نے اَدب سے کہا "آپ کا دیوان بھی تو فارسی سے مالا مال ہے" ۔۔۔ فرمایا "وہ جوانی کی نازک خیالیاں ہیں"

پھر ہنس کر بولے "شہرت! بعض شعر تو اِس قدر مُشکل میرے قلم سے نکل گئے ہیں کہ اب مَیں خود ان کے معنی بیان نہیں کر سکتا۔"

پھر فرمانے لگے "دہلی والوں کی جو صاف سُتھری اور سادی اُردو ہے اِس ہی کو شعر میں لکھنا چاہیئے۔ آخر عمر میں تو ہماری یہی رائے قائم ہوئی۔"

تو اِس طرح مرزا غالب اُن بزرگوں میں تھے جنھوں نے فارسی ملی ہوئی مُشکل اُردو کو آسان اُردو بنا دیا۔ وہ اُردو بنایا جسے آج سب سمجھتے ہیں اور پسند کرتے ہیں!

تمھیں معلوم ہے کہ مرزا کے بے شمار دوست تھے، اُتری ہندوستان میں سب ہی جگہ ان کے اشعار کا چرچا تھا۔ روزانہ ڈاک سے اُن کے پاس بیسیوں ہی خط آتے تھے، شاگردوں کے خطوں میں غزلیں بھی ہوتی تھیں جن کو مرزا ٹھیک ٹھاک کر کے واپس بھیجتے تھے۔

اُن کے خطوں کو پڑھو تو تمھیں بڑا مزہ آئے گا! ایسا تو لگتا ہی نہیں کہ خط ہے! معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمی ہیں جو آمنے سامنے

بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ خط لکھنے کا طریقہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔

دیکھو یہ خط انھوں نے اپنے ایک شاگرد میر مہدی مجروح کو لکھا ہے۔ لکھنا یہ تھا کہ میرن صاحب آئے اور ان سے یہ باتیں ہوئیں ۔۔۔۔ تو اس کو کیسے لکھتے ہیں :۔

"اے میرن صاحب — آداب — کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی ؟ — حضور میں کیا منع کرتا ہوں، مگر میں ہر خط میں آپ کی طرف سے اس کو دعا لکھ دیتا ہوں — نہیں میرن صاحب اِس خط کو آئے بہت دِن ہوئے وہ خفا ہوگا۔ اے حضرت وہ آپ کے شاگرد ہیں، خفا کیا ہوں گے۔ بھائی آخر کچھ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں روکتے ہو۔ سُبحان اللہ لیجئے حضرت! آپ خود تو خط نہیں لکھتے اور مجھ سے فرماتے ہیں کہ تو روکتا ہے — اچھا تُم نہیں روکتے، پر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں اُسے خط لکھوں — کیا عرض کردں، بات یہ ہے کہ اگر میں وہاں ہوتا اور آپ کا خط جاتا تو میں بھی سُنتا اور مزہ لیتا اور اب جو میں وہاں نہیں ہوں

تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جائے ۔ میں بس دو ایک دن میں
وہاں کے لئے روانہ ہوتا ہوں پھر آپ شوق سے خط لکھیئے۔
میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو، تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے
کیا علاقہ ۔ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمھاری باتوں میں
آگیا اور اُسے خط نہیں لکھا ۔ لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃ"۔

اِس کے بعد تب میر مہدی سے اصلی بات کہنی شروع کرتے
ہیں۔

ایک بار کسی شاگرد نے ان کے ایک اور شاگرد امراؤ سنگھ
کی دوسری بیوی کے مرنے کا حال لکھا اور یہ بھی ساتھ ہی لکھ دیا کہ
ننھّے ننھّے بچّے ہیں اب تیسری شادی نہ کرے گا تو کیا کرے گا۔
دیکھو ذرا کہ مرزا غالب اِس کا کیسا مزے دار جواب لکھتے
ہیں۔

"امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم آیا اور اپنے
واسطے جلن! اللہ اللہ، ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں
کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اُوپر پچاس برس سے جو

پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے اور نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اِس سے کہنا کہ بھائی تیرے بچّوں کو میں پال لوں گا تُو آخر کیوں بلا میں پھنستا ہے۔"

غالب کے خطوں میں زبان کے مزے کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ اُن کی زندگی کے سب حالات صحیح اور صاف ان کے خطوں میں ملتے ہیں، غدر کی ایسی تصویریں اور بیان ملتے ہیں جو تاریخ کی کسی کتاب میں نہیں مل سکتے۔ اِن کے تمام دوستوں اور شاگردوں کا پتہ چلتا ہے۔ اور اس زمانے کی دہلی کے تمام رواج، ادبی محفلیں، میلے، سیر تماشے، ریتیں رسمیں اِس طرح بیان کی گئی ہیں کہ آنکھوں کے آگے سماں کھنچ جاتا ہے۔

مثلاً دہلی میں ایک میلہ ہوا کرتا تھا جو پھول والوں کی سیر کہلاتا تھا۔ اِسی کو پنکھوں کا میلہ بھی کہتے تھے۔ کسی بیگم نے کسی منّت کے سلسلے میں خواجہ بختیار کاکی کے مزار پر پھولوں کی مسہری چڑھائی تھی، اِس میں مسہری بنانے والے نے خوبصورتی کے لئے ایک پھولوں کا پنکھا بھی لگا دیا تھا۔ بادشاہ کو یہ میلہ بڑا پسند آیا۔

دِلّی والوں سے پُوچھا کہ اگر ہر سال بھادوں پر یہ میلہ ہُوا کرے تو کیسا ہو۔ مُسلمان درگاہ پر پنکھا چڑھائیں اور ہندو جوگ مایاجی پر چڑھائیں۔

مرزا غالب ایک خط میں بے خبر کو لکھتے ہیں "اِس شہر میں ایک میلہ ہوتا ہے۔ پھُول والوں کا کہلاتا ہے، بھادوں کے مہینے میں ہُوا کرتا ہے۔ اُمرائے شہر سے لے کر غریب لوگ اور اہل حرفہ سب قُطب چلے جاتے ہیں۔ دو تین ہفتے تک وہیں رہتے ہیں۔ مُسلمان اور ہندو دونوں فرقوں کی دوکانیں شہر میں بند پڑی رہتی ہیں۔ میرے دونوں لڑکے بھی قُطب گئے ہوئے ہیں۔ اب دیوان خانے میں ایک مَیں ہُوں اور ایک داروغہ اور ایک بیمار خدمت گار۔"

اگر تمھیں غالب اور غالب کی دِلّی کے بارے میں اور باتیں معلوم کرنے کا شوق ہو تو غالب کے خطوط اکٹھا کر کے جو دو کتابیں "عود ہندی" اور "اُردوئے معلیٰ" بنائی گئی ہیں، اِن کو ضرور پڑھنا۔

اچھا اب ان کے دو خطوں میں کچھ چند سطریں اور تمہیں سُنا دیں۔ پھر مرزا غالب کے بارے میں کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں بتائیں گے۔

دیکھو یہ خط اُنھوں نے اپنے ایک ایسے دوست کو لکھا ہے جو رمضان میں روزے رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ غالب خود تو روزہ کبھی رکھتے نہیں تھے ـــ کیا مزے میں اپنے دوست کو لکھتے ہیں ـــ

"دُھوپ بہت تیز ہے، روزہ رکھتا ہوں، مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں، کبھی پانی پی لیا، کبھی حُقّہ پی لیا، کبھی کوئی روٹی کا ٹکڑا بھی کھا لیا۔ لوگ بھی عجیب ہیں، میں تو روزے کو بہلاتا ہوں اور وہ کہتے ہیں کہ تُو روزہ نہیں رکھتا ـــ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور بات ہے اور روزہ بہلانا بالکل اور بات ہے۔"

ایک خط میں برسات کی مصیبت کا حال لکھتے ہیں ـــــ

"دیوان خانے کا حال زنان خانے سے بھی بدتر ہے، میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ لیکن تکلیفوں سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی

ہو گئی ہے، بادل دو گھنٹے برستے ہیں تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔"

اپنے ایک قریبی دوست مرزا قربان علی بیگ کو لکھا ہے۔

"یہاں خدا سے کوئی اُمید نہیں، بندوں کا ذکر کیا؟ کچھ بن نہیں آتی — آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر سمجھ لیا ہے۔ جیسے دُور سے کھڑا ہو کر تماشا دیکھتا ہوں۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جُوتی لگی۔ بہت اِتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر ہوں، بڑا فارسی داں ہوں، آج دُور دُور میرا جواب نہیں۔ لے اب قرض داروں کو جواب دے ... کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صرّاف سے دام لئے جاتا تھا۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دُوں گا۔"

دیکھو — بڑا انسان اِس طرح اپنی مصیبتوں پر ہنستا ہے!

یہ وہ لوگ ہیں جو خود روتے ہیں اور دُوسروں کو

ہنستے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاؤں راستے کے کانٹوں سے لہولہان ہیں پر جو دوسروں کو راہِ زندگی کی خوبصورتی ہمیشہ دکھاتے رہتے ہیں۔

جبھی تو غالب نے کہا ہے:۔

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

دسواں باب ۱۰

تم نے وہ گانا تو کبھی ضرور سُنا ہوگا۔

"میں تو دِلّی سے دُلہن لایا رے — ہو بابو جی!"

یہ گانا سُن کر ہمارے دِل میں سب سے پہلے یہ خیال آتا ہے نا کہ دلّی کی اِس دُلہن کی صُورت کیسی ہوگی، وہ کِس طرح کے کپڑے پہنے ہوگی، کیا سنگھار کئے ہوگی، بات کرنے کا کیا انداز ہوگا، اپنے پرایوں، بڑوں چھوٹوں سے اِس کا برتاؤ کیسا ہوگا۔ ہنس مُکھ ہوگی یا ناک چڑھی، مِلنسار ہوگی یا اکھل کُھری؟

لیکن یہاں تو ہم اپنے دلّی کے دولھا کی بات کر رہے ہیں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ عُرف نوشہ میاں کی بات!

تو پہلے تُم اُن کی صُورت دیکھو۔۔۔ لمبا قد، چوڑی ہڈّیاں، ڈاڑھی نہیں رکھتے تھے البتّہ باریک باریک مونچھیں تھیں جو جوانی میں سُنہری تھیں، بُڑھاپے میں بالکل سفید ہوگئ تھیں۔ سر پر لمبے لمبے پٹّھے، آنکھیں بڑی اور روشن، رنگ گورا چِٹّا جس میں گلابی رنگ جھلکتا تھا۔۔۔ ہاتھ یعنی پنجہ بہت بڑا تھا۔ سُنتے ہیں کہ جن لوگوں کا پنجہ بڑا ہوتا ہے اُن کا دِل بھی بڑا ہوتا ہے۔ یہ بات کسی اَور کے لئے ٹھیک ہو یا نہ ہو لیکن مرزا کے لئے بالکل ٹھیک تھی۔ اُنھوں نے بہت بڑا دِل پایا تھا ہر ایک سے بڑی محبّت سے ملتے تھے اور دُوسروں کا دُکھ دیکھ کر بہت بے چَین ہو جاتے تھے۔

ایک بار اُن کے ایک دوست ان سے ملنے آئے۔ جو غدر سے پہلے بہت امیر تھے اور ہمیشہ ریشمی فرغل پہنتے تھے۔ فرغل ایک لبادہ ہوتا ہے جو جاڑوں میں سب کپڑوں کے اُوپر سے پہنا جاتا ہے۔ اِس میں بہت ہلکی سی روئی کی تہہ دے کر بڑے خوبصورت ڈورے یا گندے ڈالے جاتے ہیں اور وہ کچھ ایسی چیز بن جاتا

ہے جیسے تمھارا اوورکوٹ!

غدر کے بعد مرزا کے یہ دوست بہت غریب ہو گئے تھے، مرزا سے ملنے آئے تو سُوتی چھینٹ کا فرغل پہنے تھے۔ مرزا یہ دیکھ کر تڑپ گئے۔ بات بنا کر بولے "یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی۔ مجھ کو اس کی وضع بہت پسند آئی، ایک فرغل کی مجھ کو بھی منگوا دیجیے گا۔"

انھوں نے جواب دیا "یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور میں نے ابھی پہنا ہے۔ آپ بُرا نہ مانیں تو یہی لے لیجیے۔"

مرزا نے فوراً ان کا فرغل اُتار لیا، پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولے "مگر جاڑا بہت ہے، آپ بغیر کے کیسے گھر واپس جائیے گا۔"

اور یہ کہہ کر انھوں نے اپنا نیا ریشمی فرغل کھونٹی سے اُتار کر اپنے دوست کو پہنا دیا! —— اِس طرح اپنی غریبی میں بھی مرزا اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے برابر سلوک کرتے رہتے تھے۔

گرمیوں میں مرزا غالب نیچے کسی باریک کپڑے کا کرتا اور اُوپر تن زیب کا انگرکھا پہنتے تھے، سر پر ایک پتلے کی ہلکی سی

ٹوپی جس پر چکن یا کوئی اور نفیس اور نازک کام بنا ہوتا تھا، ایک برکا یعنی عرض کا پاجامہ سفید، ۔ پاؤں میں گھیتلی جوتی ۔ جاڑوں میں پھول دار یا کسی گہرے رنگ کا چغہ ، کسی رنگین کپڑے کا پاجامہ، سر پر سیاہ بالدار کلاہ یا اونچی دیوار کی پاپاخی کلاہ ـــــ گھر میں مرزئی بھی پہنتے تھے، ـــــ پان کبھی نہیں کھاتے تھے، البتہ حقے کا شوق تھا۔

تمھیں اتنا تو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ غالبؔ لمبے چوڑے آدمی تھے، لیکن یہ سن کر تم تعجب کروگے کہ کھانا وہ بہت ہی کم کھاتے تھے ۔ رات کو کھانے کی جگہ تھوڑی سی شراب .....

لیکن اِس شراب کا بھی ذرا حال سنو!

اِن کا ایک داروغہ تھا جس کا نام کلّو خاں تھا، اس کے پاس سامان کی کوٹھری کی کنجی رہتی تھی اور اِس کوٹھری میں شراب کی بوتل بند رہتی تھی ، کلّو خاں کو حکم تھا کہ اگر جتنا ہم پیتے ہیں اِس سے زیادہ کبھی مانگیں تو ہرگز نہ دینا۔

کلّو، شام کو، تھوڑی سی ناپ کر نکالتا ، پھر اُسے مٹّی کے

گھڑے میں ڈال دیتا، پھر اگر برف ہوتی تو گھڑا اِس میں دبا دیا جاتا ورنہ بھیگا کپڑا لپیٹ کر، چھینکے پر، ہوا کے رُخ لٹکا دیا جاتا۔ کہ ہوا لگ کر ٹھنڈا ہو جائے۔

پیتے وقت اِس میں برابر کا عرقِ گُلاب مِلاتے جاتے تھے، بس یہ شراب، تین چار تلے ہوئے کباب، کھٹی میٹھی چٹنی کے ساتھ، اور کچھ چھلے ہوئے تلے ہوئے نمکین بادام —— یہ رات کو کھاتے تھے۔

دِن کو تھوڑا سا بُھنا ہُوا گوشت، ایک پُھلکے کا چھلکا، ایک پیالی گوشت کی یخنی، دو تین پیسے بھر دہی، ایک انڈے کی زردی، ذرا سی کوئی مٹھاس۔

صُبح کو ایک گلاس مصری کا شربت جس میں کچھ بادام گھونٹ کر مِلے ہوتے تھے۔

کھانے میں بیسن کی ہر چیز شوق سے کھاتے تھے۔ کڑھی پُھلکیوں کا بہت شوق تھا، اور سالن، ترکاری جو کچھ بھی پکتا اس میں چنے کی دال ضرور ڈالی جاتی تھی۔

لیکن سب سے زیادہ آموں کا شوق تھا۔ خود منگواتے تھے، شہر سے لوگ بھیجتے تھے، دُور دراز سے دوستوں کے یہاں سے تحفے میں آتے تھے لیکن اُن کا جی نہ بھرتا تھا۔

ایک بار بہادر شاہ ظفر کے ساتھ اُن کے باغ میں ٹہل رہے تھے۔ برسات کا زمانہ تھا، آموں کی رُت زوروں پر تھی اور اِس باغ میں بہترین آم ہوتے تھے، البتہ شاہی خاندان کے علاوہ اور کوئی اِن آموں کو نہیں کھا سکتا تھا! مرزا غالب ٹہلتے ٹہلتے، ایک ایک درخت کو جھانک جھانک کر غور سے دیکھتے تھے۔

بادشاہ نے پوچھا "مرزا اتنے غور سے کیا دیکھتے ہو"؟

کہنے لگے "حضور — سُنتے ہیں کہ دُنیا میں ہر دانے پر لکھا ہوتا ہے کہ مَیں فلاں کے بیٹے فلاں اور فلاں کے پوتے فلاں کی تقدیر ہوں۔ تو مَیں یہ دیکھتا ہوں کہ اِن آموں میں سے کسی پر میرے باپ دادا کا بھی نام لکھا ہے یا نہیں۔"

بادشاہ ہنسنے لگے اور شام ہی کو ایک ٹوکرا بھر کر بہت عُمدہ عُمدہ چُنے ہوئے آم مرزا کے لئے بھجوائے۔

ایک بار کچھ دوست جمع تھے اور آموں پر بحث ہو رہی تھی کہ آم میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں، فضل الحق خیرآبادی بھی تھے۔ اُنھوں نے مرزا سے کہا "بھئی تم بھی اپنی رائے بتاؤ"

مرزا نے کہا "میرے نزدیک تو آم میں صرف دو خوبیاں ہونی چاہئیں — میٹھا ہو اور بہت ہو!"

سب ہنسنے لگے!

تم نے اکثر بڑے آدمیوں کی زندگی کے حالات پڑھتے وقت اِس بات پر غور کیا ہوگا کہ وہ نیچ لوگوں کی باتوں پر غُصّہ نہیں کرتے بلکہ گھٹیا بات کو اِس مزے سے ٹال دیتے ہیں کہ وہ بات کہنے والا سب کی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے اور ان کی عزّت بنی کی بنی رہتی ہے۔

مرزا غالبؔ کے شاگرد مولانا حالیؔ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بار کسی نے غالبؔ کو ایک خط لکھا جس میں ان کو شراب پینے اور آزادانہ شعر کہنے پر ماں کی گالی لکھی تھی! مرزا غالبؔ خط پڑھ کر مُسکرائے اور بولے "اِس اُلّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔

بڈھے کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اُسے غیرت آئے، جوان کو بی بی کی گالی دیتے ہیں کیونکہ وہ بی بی ہی کو سب سے زیادہ پیار کرتا ہے بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی کو نہیں چاہتا۔ اِس سے زیادہ بے وقوف کون ہوگا کہ ستّر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے۔"

تمام بڑے فن کاروں کی طرح مرزا غالب کو بھی بچوں سے بہت محبّت تھی۔ افسوس ہے کہ ان کے سات بچے ہوئے پر کوئی زندہ نہ رہا۔ اپنے بھانجے عارف کے مرنے کے بعد ان کے دو بچوں کو اپنے پاس رکھتے تھے اور ان کو بہت چاہتے تھے۔ یہ بچے اکثر ان کے کاغذات اِدھر سے اُدھر کر دیتے۔ کیچڑ بھرے پیر لے کر ان کے صاف ستھرے اُجلے بستر پر کود پڑتے، طرح طرح کی ضدیں کرتے، لیکن مرزا اِن کو ہمیشہ پیار پچکار کر منا لیتے۔ جب بھی بازار جاتے تو بچوں کے لئے مٹھائیاں اور کھلونے ضرور لاتے۔

جیسی ہنسی دِل لگی تم نے مرزا کے خطوں میں دیکھی ہے،

ویسی ہی اُن کی زِندگی میں بھی تھی، وہ بات کیا کرتے تھے، گویا
مُنھ سے پھُول جھڑتے تھے۔ گھر میں اور باہر، چھوٹے اور
بڑے سب سے اُن کی چھیڑ چلتی رہتی تھی۔

ایک بار کھانا کھانے بیٹھے تو بہو (ان ہی دوستوں میں سے
بڑے لڑکے کی بیوی) کی وجہ سے چنے کی دال کسی سالن یا ترکاری
میں نہیں پڑی تھی۔ پُوچھنے لگے "بھئی کیا گھر میں چنے کی دال
ختم ہوگئی۔ اگر نہیں تھی تو منگوالی ہوتی یا مجھ سے کہتیں میں
منگوا دیتا۔"

(دادا کھانے پکانے والی) بولیں "کہ نہیں دال تو گھر میں
تھی لیکن بہو چنے کی دال نہیں کھاتیں اِس لئے نہیں ڈالی گئی۔"
بولے "واہ ہو۔ تو گویا بہو خدا سے بھی بڑھ گئیں۔"

پھر امراؤ بیگم سے بولے "سُنو بیوی۔"

وہ بگڑ کر بولیں "مَیں نہیں سُنتی۔"

ہنس کر بہو سے بولے "تم سُنو۔ بات یہ ہے کہ ایک دفعہ
چنا خدا سے فریاد کرنے گیا کہ باری تعالیٰ یہ کیا بات ہے کہ

جتنا مجھ کو تنگ کیا جاتا ہے، کسی کو نہیں کیا جاتا، بھُونتے ہیں، تلتے ہیں، اُبالتے ہیں، پیستے ہیں، دال بناتے ہیں، بیسن بناتے ہیں، آخر میرا کیا گناہ ہے"۔ خدا نے چنے کی طرف دیکھا اور کہا "دُور رہو۔ نہیں تو میں بھی تجھے کھا جاؤں گا"۔
سب لوگ ہنسنے لگے!

روزوں کے مہینے میں چوسر کھیلنا بھی بُرا سمجھا جاتا ہے اور بڑے بوڑھے یہ بھی کہتے ہیں کہ شیطان چونکہ انسان کو بہکا کر بڑے بڑے کام کرواتا ہے اس لئے رمضان بھر کے لئے اللہ میاں اِس کو قید کر دیتے ہیں تاکہ اِس مہینے میں کسی انسان سے کوئی بُرا کام نہ ہو۔

ایک بار ایسا ہُوا کہ رمضان میں مرزا غالب اور ان کے کچھ دوست اندر کی کوٹھری میں بیٹھے چوسر کھیل رہے تھے کہ مولانا آزردہ آئے۔ یہ بہت مذہبی آدمی تھے۔ مرزا کو چوسر کھیلتے دیکھ کر بولے "واہ۔ ہم نے تو سُنا تھا کہ رمضان میں شیطان قید رہتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بات ٹھیک

نہیں۔"

مرزا نے چوسر کھیلتے کھیلتے مُسکرا کر جواب دیا "نہیں۔ وہ بات تو ٹھیک ہے البتہ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ یہی وہ کوٹھری ہے جس میں شیطان بندر رہتا ہے۔"

ایک دِن مرزا غالب کچھ بیمار تھے، پلنگ پر لیٹے تھے اُن کے شاگرد میر مہدی آئے، مرزا نے اُن کو وہیں بُلوا لیا۔ وہ پائنتی بیٹھ کر پاؤں دبانے لگے۔ مرزا نے کہا "بھائی تُو سیّد ہے، میرا پاؤں نہ دبا۔ مجھے گُناہ ہوگا۔"

میر مہدی بولے "اچھا۔ آپ پَیر دابنے کی مزدُوری دے دیجئے گا۔"

مرزا نے کہا "ہاں اِس میں کوئی حرج نہیں۔"

جب میر مہدی نے مزدُوری مانگی تو جواب مِلا "کیسی مزدُوری، تُم نے میرے پاؤں دابے، مَیں نے تمھارے پیسے دابے، حساب برابر ہُوا۔"

ایک دِن ایک دوست ان سے مِل کر واپس جا رہے تھے

مرزا نے خود موم بتی اُٹھائی اور بڑی مُشکل سے کھسکتے کھسکتے جُوتوں تک آئے ۔ اِس زمانے میں بیمار اور کمزور تھے۔ ان کے دوست نے کہا "جناب آپ نے کیوں اِس قدر تکلیف کی۔ میں خود ہی دیکھ کر اپنا جُوتا پہن لیتا۔"

مرزا بولے "حضور، میں آپ کا جُوتا دکھانے کے لئے شمع نہیں لایا ہوں بلکہ اِس لئے لایا ہوں کہ آپ کہیں میرا جُوتا نہ پہن جائیں۔"

مرزا صاحب کے شعر پڑھنے کا یہ انداز تھا کہ دوزانو بیٹھے اور ہلکے ترنم سے پہلا مصرع پڑھتے، پھر پہلے ہی مصرعے کو آہستہ آہستہ دوہراتے اور راگ ذرا ٹھہر کر دُوسرا مصرع بھی اسی طرح، اِسی لہجے اور ترنم میں سُناتے ۔ جب کوئی صاحب مصرع اُٹھاتے یا داد دیتے تو مرزا صاحب کا دایاں ہاتھ بے اختیار نہ تھوڑا سا اُٹھ جاتا اور بس ۔ ورنہ اِسی طرح دل جمعی سے اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے، اور پہلو تک نہ بدلتے!

دِن کا بیشتر حصّہ دیوان خانے میں گزرتا تھا ۔ صبح

ناشتے کے بعد دوستوں کو خطوط لکھتے تھے، خط لکھ کر لفافے پر پتہ لکھتے تھے۔ کلّو داروغہ بند کر کے ٹکٹ لگاتے تھے۔ دوپہر کو کوئی قصّہ کہانی کی کتاب دیکھتے یا چوسر کھیلتے، کبھی گلی قاسم جان سے کوئی لڑکا آنکلتا تو اس کو اوپر بلا لیتے اور اس سے ذرا دیر ہنسی مذاق کر کے کچھ اپنا مگر زیادہ اس کا جی خوش کرتے۔ شام کو نیچے اترتے، مونڈھے بچھائے جاتے، خود ایک بڑے سے مونڈھے پر ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھتے، چپلیں آگے پڑی رہتیں، اس مونڈھے پر لال کھاروے کا غلاف ہوتا تھا۔ قریب کے لوگ تو پیدل آتے، دور والے پالکی پر۔ پالکی دروازے پر رکی، وہ صاحب نیچے اترے، مرزا نے ذرا جھانک کر دیکھا اور پھر اپنے خاص لہجے میں لفظوں کو خوب کھینچتے ہوئے کہا "آئیے آئیے۔ مزاج کیسا ہے؟" — آخر عمر میں اونچا سننے لگے تھے اس لئے جب کوئی بات کرتا تو سننے کے لئے کان اس کی طرف جھکا دیا کرتے تھے۔ دن میں کم از کم ایک بار اندر زنان خانے میں، ایک موٹی سی لکڑی ٹیکتے ٹیکتے ضرور جاتے!

رات کے وقت شعر کہتے تھے!

ایک صاحب نے ان کے متعلق بڑی مزیدار بات لکھی ہے جو شعر کہنے کے متعلق ہے۔ لکھتے ہیں "جب ہم دونوں دیوان خانے میں جا کر بیٹھے تو میں نے دیکھا کہ ان کے کمر بند میں نوُ عدد گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ مجھ کو مذاق سوجھا، میں نے کہا "قبلہ ۔ کیا رات کو تسبیح پھیرتے رہے تھے"؟

کہنے لگے "نہیں تو۔ تم کاغذ قلم لو اور لکھتے جاؤ"

میں نے حکم کی تعمیل کی ۔ انھوں نے پہلی گرہ کھولی، کچھ سوچا اور پھر غزل کے مطلع کا شعر لکھوایا۔

پھر دوسری گرہ کھولی ۔ دوسرا شعر لکھوایا ۔ اس طرح نوُ گرہیں جب کھل چکیں تو نوُ شعر کی غزل پوری ہو گئی!

کہنے لگے "بھائی میں ہمیشہ رات کے وقت غزل کہتا ہوں، دن میں شعر کبھی کہا ہی نہیں! اب حافظہ بہت کمزور ہو گیا ہے اور رات کو روشنی اور لکھنے کا سامان کون ڈھونڈتا پھرے، تو اس طرح گرہیں لگا کر سو رہتا ہوں، صبح کو اٹھ کر اور حافظہ کو ٹٹول

ٹٹول کر شعر یاد کرتا ہوں ۔ دیکھو پُورے کے پُورے شعر یاد آ گئے نا"؟

آخر عُمر میں مرزا کے جسم پر بہت سے پھوڑے نکل آئے تھے روز نشتر لگتا، صفائی ہوتی، بتّی اور دوائیں اِس میں رکھی جاتیں، دیکھنے والے کانپ کانپ اُٹھتے، مگر وہ بڑی خاموشی اور بڑے صبر سے نشتر لگواتے، اور مرہم پٹی کرواتے ۔ یہ پھوڑے تو اچھے ہو گئے، لیکن اِن کی وجہ سے کمزوری بہت بڑھ گئی ۔ بقول خود مرزا غالب کے "جسم کا سارا خُون پیپ بن کر بہہ گیا ۔ اِس کمزوری سے وہ پنپ نہیں سکتے ۔

ہم نے تم سے ان کے بھانجے عارف کے دو لڑکوں کا ذکر کیا ہے نا ۔ بڑے والے کی شادی ہو گئی تھی ۔ اِس کے ایک چھوٹی سی بچّی تھی، کوئی چار پانچ سال کی رہی ہو گی ۔ اِس بچّی سے بہت محبّت کرتے تھے اور اس کو پیار سے جیون بیگ کہتے تھے ۔

۱۴ فروری ۱۸۶۹ء کو، دوپہر کے وقت پلنگ پر لیٹے تھے،

ویسے اچھے تھے لیکن کمزوری بہت بڑھ گئی تھی، نوکر نے پوچھا۔
"کھانا لاؤں"

اُٹھ کر بولے "آج جیون بیگ کے ساتھ کھانا کھائیں گے اس کو اندر سے بُلا لاؤ" ـــــ داروغہ اندر گیا تو بہو صاحب نے کہلوایا کہ "سو گئی ہے، ابھی جاگتی ہے تو بھیجتی ہوں" ـــــ یہ سُن کر کہنے لگے "اچھا ـــ جب وہ اُٹھ جائے تو کھانا لانا" یہ کہہ کر پھر لیٹ گئے اور تکیے پر سر رکھتے ہی بے ہوش ہو گئے!

دِلّی کے سارے حکیم اکٹھے ہو گئے، شہر میں آگ لگنے کا سا غُل مچ گیا، جس جس نے سُنا، جس حالت میں تھا، اُسی میں دَوڑا ہُوا آیا، حکیموں نے تجویز کیا کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ آٹھ پہر اِسی طرح گزرے ـــــ دُوسرے دن اِسی حالت میں دوپہر ڈھلے اُردو شاعری کا یہ چراغ ہمیشہ کے لئے گُل ہو گیا ـــــ

کیسے مُبارک ہیں وہ لوگ جن کی زندگی شمع کی طرح ہوتی ہے ـــ خود آنسو بہاتے ہیں، گُھل گُھل کر ختم ہو جاتے ہیں ـــ پر دوسروں کے لئے اندھیرے میں روشنی کی کرنیں پھیلاتے

رہتے ہیں —— اسی لئے تو یہ وہ لوگ ہیں جو کبھی نہیں مرتے — زندگی کی ریت پر جن کے تلووں کی چھاپ ایسی ہوتی ہے جو اپنے بعد آنے والوں کو زندگی کی خوبصورتی، محبت اور قوت کا سبق دیتی ہے۔

ہماری دوسری کتابیں

جبران	بشیر هندی	4.00
ادیب	ڈاکٹر طه حسین	4.00
جمال الدین افغانی	مرزا ادیب	1.75
خالد بن ولید	ترجمه حبیب اشعر	10.00
اشتراکی چین	ارشاد احمد	5.00
تغیر عظیم	ترجمه خالد لطیف	6.50
جان کینیڈی	,, ,,	1.50
جیکولین کینیڈی	بانو قدسیه	3.50
لنڈن جانسن	ترجمه مکین احسن کلیم	4.00
آندھی میں چراغ	خواجه غلام السیدین	9.00
جرأت کے پیکر	جان کینیڈی	6.00
استقلال کے پیکر	ترجمه حبیب اشعر	7.50
گنج ہائے گرانمایه	رشید احمد صدیقی	6.00
روح اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	10.00
داغ	تمکین کاظمی	7.50
ہادئ ہریانه	منظور الحق صدیقی	2.00
بچے کی تعلیم	ترجمه فضل محمد خاں	9.00
تعلیم کے مقاصد	ترجمه ڈاکٹر سید عبدالله	6.50
تعلیمی مقالات	,, سید وقار عظیم	7.00
تعلیم اور تہذیب نفس	,,	3.50
اردو غزل	,,	16.00
حسرت کی شاعری	,,	2.00
امریکی ناول اور اسکی روایات	,,	5.00
ایمرسن کے مضامین	,,	5.00
مضامین فلک پیما	میاں عبدالعزیز	9.00
جینے کے طریقے	تمکین کاظمی	4.00
آئینۂ فرنگ	شاکر شمسی	4.00
یادگار حالی	صالحه عابد حسین	6.00
ادبی جھلکیاں	,,	5.50
اختر شیرانی اور اسکی شاعری	اختر جعفری	6.00

مفصل فہرست طلب کریں

آئینه ادب ، چوک مینار، انارکلی ، لاہور

حالی کا سیاسی شعور

معین احسن جذبی

مولانا حالی کا نام ہمارے ان بزرگوں کی فہرست میں سب سے نمایاں ہے جنہوں نے اردو شاعری کو نیا رنگ عطا فرمایا اور ہمارے ادب و تنقید کو وقت کی جدید ضرورتوں اور نئے تقاضوں کے سانچے میں ڈھالا۔

پروفیسر جذبی نے اپنی اس مفید و کارآمد تصنیف میں مولانا حالی کے سیاسی شعور کا تجزیہ بڑے فکر انگیز اسلوب میں کیا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ اردو کے ہر طالب علم کے لئے ناگزیر ہے۔ اسے پڑھے بغیر کوئی شخص مولانا حالی کو پوری طرح جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

قیمت: پانچ روپے پچاس پیسے

آئینۂ ادب، چوک مینار، انارکلی، لاہور

سرورق رین پریس لمیٹڈ، لاہور میں چھپا